معارف

مارچ ۲۰۱۹ء

مجلس دارالمصنّفین کا ماہوار علمی رسالہ

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ

سالانہ زرتعاون

ہندوستان میں سالانہ ۲۸۰/روپئے۔ فی شمارہ ۲۵/روپئے۔ رجسٹرڈ ڈاک ۴۸۴/روپئے
دیگر ممالک میں سادہ ڈاک ۱۶۶۰/روپئے۔ دیگر ممالک رجسٹرڈ ڈاک ۱۷۸۰/روپئے
ہندوستان میں ۵ سال کی خریداری صرف ۱۳۰۰/روپئے میں دستیاب۔

پاکستان میں ماہنامہ معارف کے لئے رابطہ کریں

HAFIZ SAJJAD ELAHI
196 - AHMAD BLOCK, NEW GARDEN TOWN
LAHORE (PUNJAB) PAKISTAN
Tel: 0300 - 4682752, (R) 5863609, (O) 7280916
Email: abdulhadi_133@yahoo.com

سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔ بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں۔

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY, AZAMGARH

- زرتعاون ختم ہونے پر تین ماہ کے بعد رسالہ بند کردیا جائے گا۔
- معارف کا زرتعاون وقت مقررہ پر روانہ فرمائیں۔
- خط وکتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔
- معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔
- کمیشن ۲۵ فیصد ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہئے۔

Email: shibli_academy@rediffmail.com, info@shibliacademy.org
Website: www.shibliacademy.org
Bank Name: Punjab National Bank - Heerapatti, Azamgarh
Account No: 4761005500000051 - IFSC No: PUNB0476100
(Office Mobile) 09170060782

ڈاکٹر فخر الاسلام اعظمی (جوائنٹ سکریٹری/منیجر) نے معارف پریس میں چھپوا کر
دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ سے شائع کیا۔

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کا علمی ودینی ماہنامہ

معارف

جلد نمبر ۲۰۳ ماہ رجب المرجب ۱۴۴۰ھ مطابق ماہ مارچ ۲۰۱۹ء عدد ۳

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی
پوسٹ بکس نمبر: ۱۹
شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یوپی)
پن کوڈ: ۲۷۶۰۰۱

فہرست مضامین

شذرات ۱۶۲
اشتیاق احمد ظلی

مقالات
مکاتیب سنائی میں عربی اقتباسات پر ایک نظر ۱۶۵
ڈاکٹر محمد اجمل اصلاحی
کرامت حسین کنتوری اور فقہ اللسان ۱۸۳
ڈاکٹر قمر اقبال
شری مد بھگوت گیتا اور مسلم مصنّفین ۱۸۹
ڈاکٹر ٹی۔آر۔رینا
سفر نامۂ شبلی کی علمی اور سماجی جہتیں ۲۰۵
ڈاکٹر محمد صہیب
اخبار علمیہ ۲۱۸
ک۔ص اصلاحی

باب التقریظ والانتقاد
چند علمی تحفے ۲۲۱
ع۔ص

آثار علمیہ وتاریخیہ
ریویو موازنہ انیس ودبیر..... ۲۲۴
اشتیاق احمد ظلی
مکتوب شیخ عنایت اللہ بنام...... ۲۲۹
کلیم صفات اصلاحی

معارف کی ڈاک
فکر ونظر کے سال اجرا کے بارے میں ایک غلط فہمی کا ازالہ ۲۳۴
شمس بدایونی
دولت عثمانیہ ۲۳۵
پروفیسر محمد حسان خان

ادبیات
بیادگار معارف اعظم گڑھ ۲۳۷
جناب زاہد جعفری
خودکلامی ۲۳۸
ڈاکٹر ابرار اعظمی
مطبوعات جدیدہ ۲۳۹
ع۔ص
رسید کتب ۲۴۰

شذرات

ہندی زبان کے نامور اور سب سے قدآور ادیب، مصنف، شاعر اور نقاد پروفیسر نامور سنگھ نہیں رہے۔ ۱۹/فروری کو دہلی میں انہوں نے ۹۲ سال کی عمر میں اس دار فانی سے کوچ کیا۔ وہ نصف صدی سے زیادہ عرصہ تک ہندی کے علمی اور ادبی مطلع پر چھائے رہے۔ ایسا کم ہوتا ہے کہ کوئی ادیب، نقاد اور شاعر علم و ادب کی مملکت پر اتنے طویل عرصہ تک حکمرانی کرتا رہے۔ ان کی وفات سے ہندی زبان و ادب کے ایک روشن عہد کا خاتمہ ہوگیا۔ واقعہ یہ ہے کہ ان کے رخصت ہوجانے سے جو خلا پیدا ہوا ہے اس کا پُر ہونا مشکل ہے۔ نامور سنگھ ۱۹۲۶ء میں بنارس کے ایک گاؤں جیین پور میں پیدا ہوئے۔ اب یہ چندولی کا حصہ ہے۔ اعلیٰ تعلیم بنارس ہندو یونیورسٹی میں حاصل کی جہاں ۱۹۵۱ء میں ان کو پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری تفویض کی گئی۔ ان کے نگراں ہندی کے عظیم ادیب ہزاری پرساد دویدی تھے۔ طالب علمی کے زمانہ میں ہی ان کی شہرت ایک اچھے اسکالر کی حیثیت سے ہوگئی تھی۔ تعلیم سے فراغت کے بعد کچھ دنوں انہوں نے اپنی مادر علمی ہی میں تدریسی خدمات انجام دیں۔ بعد میں وہ ساگر یونیورسٹی اور جودھ پور یونیورسٹی سے بھی وابستہ رہے۔ لیکن ان جامعات میں ان کا قیام بہت مختصر رہا۔ اس کا سبب غالباً مارکسٹ نظریات سے ان کی وابستگی تھی۔ بالآخر یہ سفر جواہر لال نہرو یونیورسٹی پر ختم ہوا جہاں گویا ان کو اپنی منزل مراد مل گئی۔ پھر وہ وہیں کے ہوکر رہ گئے۔ یہاں ان کو اپنے مزاج اور افتادِ طبع کے مطابق کام کرنے کا موقع ملا۔ یہاں انہوں نے سنٹر آف انڈین لینگویجز قائم کیا اور اس کے پہلے سربراہ مقرر ہوئے۔ ۱۹۹۲ء میں ریٹائرمنٹ کے بعد بھی پروفیسر ایمریٹس کی حیثیت سے آخر تک اس مرکز سے ان کا تعلق قائم رہا۔ واقعہ یہ ہے کہ اس کے روح رواں وہی تھے۔ یہیں سے ہندی زبان وادب کی مملکت میں انہوں نے راج کیا۔ تدریس سے ان کو فطری لگاؤ تھا اور وہ بہت اچھے استاد تھے۔ آخر تک وہ بڑی دلچسپی اور لگن سے یہ فریضہ انجام دیتے تھے اور اس کے لیے پوری تیاری کرتے تھے۔ انہوں نے طلبہ کی کئی نسلوں کو پڑھایا، ان کی تربیت کی اور کتنے ہی لوگوں کو قلم پکڑنے کا سلیقہ سکھایا اور ہندی زبان و ادب کے میدان میں کشادہ ذہنی کی ایک صحت مند روایت کی آبیاری کی۔ ان کے لکچر میں کچھ ایسی کشش ہوتی تھی کہ اس میں وہ طلبہ بھی آجاتے تھے جن کا یہ موضوع نہیں ہوتا تھا۔ وہ بڑے کھلے دل سے نوجوان ادیبوں اور لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ کسی کی کوئی اچھی تحریر دیکھتے تو خط یا فون کے ذریعہ اس کی حوصلہ افزائی کرتے۔ امید کی جانی چاہیے کہ ان کی قائم کی ہوئی صحت مند روایتیں باقی رہیں گی اور ان کا علمی

ورثہ اوران کے تربیت یافتہ طلبہ ان کے نام اور کام کو زندہ رکھیں گے۔

ہندی زبان وادب کی ایک نمایندہ شخصیت کے طور پر پروفیسر نامور سنگھ کی کئی جہات تھیں اور سب قابل توجہ اور اہم۔ ان کی بنیادی شناخت ایک ناقد کی تھی۔ اس موضوع پر ان کا کام غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔ لیکن یہاں بھی انہوں نے اپنی ایک الگ راہ نکالی جو اس میدان میں کام کرنے والے دوسرے اسکالرس سے یکسر الگ اور ممتاز تھی۔ اتنے بڑے دانشور ہونے کے باوجود ان کی تنقید خالص اکیڈمک اور کتابی نہیں ہوتی تھی جو ایک عام قاری کی دسترس سے باہر ہو۔ تنقید کے میدان میں ان کا اصل کارنامہ یہ ہے کہ وہ اسے اس طرح پیش کرتے تھے کہ وہ ایک عام قاری کی گرفت میں آسکے اور وہ اسے اتنا دلچسپ بنادیتے تھے کہ ایک عام پڑھنے والا بھی اس سے لطف اندوز ہوسکے۔ اہل نظر سمجھ سکتے ہیں کہ یہ کام کتنا مشکل ہے۔ اگر زندگی کا کوئی شعبہ بھی تنقید سے ماورا نہیں ہے جیسا کہ ان کا ماننا تھا تو اس کو ایسا ہونا چاہیے کہ زندگی کے ہر طبقہ کے لیے اس سے استفادہ ممکن ہو اور یہ صرف ایلیٹ اور اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ تک محدود نہ ہو اور اس کو سمجھنے کے لیے اعلیٰ ادبی مباحث سے واقفیت ضروری نہ ہو۔ عام طور پر تنقید نگار جس سطح سے گفتگو کرتے ہیں اور اپنے مطالب کے اظہار وابلاغ کے لیے زبان وبیان کے جن اسالیب کو استعمال کرتے ہیں وہ ایک عام قاری کے ادراک سے باہر ہوتا ہے جو ان کی باریکیوں سے واقف نہ ہو۔ نامور سنگھ نے تنقید کے اس عمل کو عام فہم بنادیا اور اس کو اس کے بلند پائیدان سے اتار کر عام قاری کی دسترس تک پہنچا دیا۔ ان کو ہندی تنقید میں حاشیہ کو مرکزی مقام دینے والے ادیب کی حیثیت سے جانا جاتا ہے۔ یہ کوئی معمولی کارنامہ نہیں ہے۔

نامور سنگھ نے بہت لکھا، بہت سی نہایت اعلیٰ درجہ کی کتابیں تصنیف کیں اور بہت بلند رتبہ ادب تخلیق کیا۔ لیکن اپنی عمر، تجربہ اور لیاقت کے اعتبار سے انہوں نے کم لکھا۔ خاص طور پر عمر کی آخری منزل میں انہوں نے لکھنا تقریباً بند کردیا تھا اور معاشرہ سے ان کا تعلق گفتگو اور لکچرس کے ذریعہ باقی تھا۔ ان کے ادبی ورثہ کو دیکھتے ہوئے ان سے بجا طور پر اس سے زیادہ کی توقع کی جاتی تھی۔ زیادہ لکھے اور کم پڑھے لوگوں کے اس دور میں یہ بات بہت زیادہ اہمیت کی حامل ہے۔ انہیں مطالعہ اور کتب بینی کا بہت شوق تھا۔ مطالعہ کا یہ شغف ان کی زندگی کے آخری وقت تک قائم رہا۔ ان کے یہاں آنے جانے والوں کو ہر طرف کتابیں ہی نظر آتی تھیں۔ وہی ان کی انیس وددمساز تھیں۔ ان کا یہ مطالعہ کا شغف شاید انہیں زیادہ لکھنے کا موقع نہیں دیتا تھا۔ ان کے اندر غیر معمولی حد تک انکسار کا عنصر تھا۔ شاید اس میں اس کا بھی کچھ دخل ہو۔ بعض لوگوں نے ان کو

Reluctant Writer کا خطاب دیا ہے، ایک ایسا مصنف جو مجبوراً ہی کچھ لکھتا تھا۔ اس کے باوجود انہوں نے جو علمی ورثہ یادگار چھوڑا ہے وہ اپنی قدر و قیمت کے لحاظ سے تو اہم ہے ہی کمیت میں بھی کچھ ایسا کم نہیں ہے۔ ان کی کتابوں میں کویتا کے نئے پر۔یتمان، چھایاواد، دوسری پرمپرا کی کھوج اور اتہاس اور آلوچنا شامل ہیں۔ ۱۹۷۱ء میں کویتا کے نئے پر۔یتمان کے لیے ان کو ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا۔ اس کے علاوہ بھی ان کو کئی اور ایوارڈ تفویض کیے گئے۔ ہفتہ وار جن یوگ اور علمی اور ادبی ماہنامہ آلوچنا کی ادارت بھی وہ کرتے تھے۔ سنسکرت سے گہری واقفیت تھی۔ اردو سے دلچسپی اور کسی قدر واقفیت تھی۔ مناسب موقعوں پر اردو اشعار استعمال کرتے تھے۔ شبلی اکیڈمی سے واقف تھے اور اس کی قدر کرتے تھے۔ شبلی صدی تقریبات میں آنے کی خواہش تھی لیکن بیماری کی وجہ سے ممکن نہیں ہوا۔ مارکسٹ نظریات سے زندگی بھر وابستہ رہے۔ دنیا بھر کا سفر کیا لیکن امریکہ کبھی نہیں گئے۔

اتنی غیر معمولی علمی اور ادبی سرفرازیوں کے بعد بھی ان کی شخصیت پر اس کا بوجھ نہیں محسوس ہوتا تھا۔ وہ اپنی تمام تر علمی اور ادبی وجاہت کے باوجود نہایت سادگی اور خوش اطواری سے زندگی گذارتے تھے۔ ان کے عادات و اطوار میں علمی ترفع اور دانشورانہ تکبر کا کوئی شائبہ بھی نظر نہیں آتا تھا۔ اعلی ترین علمی اور ادبی سرگرمیوں کے درمیان عام آدمی سے ان کا رابطہ ہمیشہ قائم رہا۔ وہ اعلیٰ درجہ کے مقرر تھے اور ان کو جہاں بھی گفتگو اور لکچر کے لیے بلایا جاتا وہاں جاتے اور اپنی بات پوری قوت سے کہتے۔ علمی اور ادبی مجلسوں میں ان کو سننے کے لیے لوگ بڑی تعداد میں آتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کو پبلک لکچرر اور پبلک انٹلیکچوئل کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ عوامی دانشور کا خطاب اپنے طرز کا انوکھا خطاب ہے اور شاید ان سے پہلے کوئی اور اس سے سرفراز نہیں ہوا۔ یہ آدمی کی اپنی زمین سے جڑے رہنے کی علامت ہے۔ وہ دوسروں کی بات بہت تحمل سے سنتے تھے اور ان کا جواب دلیل سے دیتے۔ ناملائم اور سخت الفاظ کا استعمال ان کی عادت نہیں تھی۔ وہ فرقہ پرستی اور حکومتی جبر کے ہمیشہ مخالف رہے اور جب اور جہاں ضرورت ہوتی اس کے خلاف واضح موقف اختیار کرتے اور پوری قوت سے اس کی مخالفت کرتے۔ ایک ایسے وقت میں جب وطن عزیز میں تمام مذہبی، تہذیبی اور سماجی دھاروں کو ایک دھارے میں ضم کردینے کی کوشش اپنے نقطہ عروج پر ہے اور جب فرقہ پرست قوتیں تمام شناختوں کو مٹا کر صرف ایک شناخت کی بالادستی کے لیے کوشاں ہیں، نامور سنگھ جیسے کشادہ ذہن اسکالر کا رخصت ہوجانا ایک بڑا سانحہ ہے۔ یہ نقصان صرف ہندی زبان و ادب کا نہیں ہے بلکہ پورے ہندوستانی سماج کا ہے۔

مقالات

مکاتیب سنائی میں عربی اقتباسات پر ایک نظر

ڈاکٹر محمد اجمل اصلاحی

حکیم سنائی غزنوی کے مکاتیب کا مجموعہ پہلی بار مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے ۱۹۶۲ء(۱) میں شائع ہوا۔ یہ مجموعہ جو ۷۱ خطوط پر مشتمل تھا، ''مکاتیب سنائی'' کے نام سے، فارسی زبان وادب کے مایۂ ناز ہندوستانی محقق پروفیسر نذیر احمد (ف ۱۹ اکتوبر ۲۰۰۸ء) نے مرتب کیا تھا۔

ان مکاتیب کی تدوین میں گوناگوں دشواریاں تھیں۔ اول تو ان کے دقیق حکیمانہ مضامین، دوسرے سنائی کا سنگلاخ اسلوب (۲)، جس میں دستور زمانہ کے مطابق تشبیہات و استعارات کی کثرت، پے در پے طویل مرکب جملے، صنائع و بدائع سے لدی پھندی عبارتیں، اوران میں آیات و احادیث، بزرگوں کے اقوال، ضرب الامثال، ادبائے عرب کے مسجع فقرے، اور فارسی وعربی اشعار کہیں مکمل، کہیں ان کے ٹکڑے، حسب ضرورت ٹانکتے چلے جاتے ہیں۔ تیسری مشکل جو ہمت شکن تھی وہ یہ کہ مکاتیب کے دستیاب قلمی نسخوں کے متن میں شدید اختلاف تھا، اوران میں سے کوئی نسخہ بھی قدیم اور صحت کے اعتبار سے قابل اعتماد نہ تھا کہ اسے بنیاد بنایا جا سکے۔ بعض الفاظ ایسے ''دست و پا شکستہ'' تھے کہ تمام تر کوشش کے باوجود ان کی خواندگی نہ ہوسکی۔ جہاں تک عربی اقتباسات کا تعلق ہے تو مرتب مرحوم ہی کے الفاظ میں ''خیلے مغلوط نوشتہ شدہ است''۔(۳)

ڈاکٹر نذیر احمد صاحب کے پیش نظر انڈیا آفس لائبریری لندن، جامعہ عثمانیہ حیدرآباد، حبیب گنج علی گڑھ اور آکسفورڈ کے کتب خانوں کے چار قلمی نسخے تھے (۴)۔ ایک پانچواں نسخہ کابل میں سرورخان گویا کے ہاتھ آیا تھا جس کی بنیاد پر انہوں نے سنائی کے مکاتیب مجلہ آریانا میں شائع کیے تھے۔ اس نسخے میں کئی نقص تھے، تاہم ڈاکٹر صاحب نے اس کا عکس حاصل کرنے کی کوشش کی جو بارآور

سعودی عرب، ریاض۔

نہ ہوسکی۔سرور خان گویا نے ان کے استفسار کے جواب میں لکھا کہ انہوں نے یہ نسخہ عاریتاً تہران کے مویدثابتی کو دیا تھا،لیکن موخر الذکر کی جانب سے ڈاکٹر صاحب کو مطلع کیا گیا کہ یہ نسخہ ان کے پاس موجود نہیں (۵)۔ان نسخوں کے علاوہ حبیب گنج علی گڑھ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور خدا بخش میں محفوظ تین بیاضوں میں بھی بعض مکاتیب کا انکشاف ہوا۔مجلہ آریانا کی طرح بعض خطوط اس سے قبل دوسرے رسائل اور مجموعوں میں بھی شائع ہوچکے تھے۔ڈاکٹر صاحب نے مذکورہ بالا قلمی نسخوں اور بیاضوں کے ساتھ ان متفرق اشاعتوں کو بھی سامنے رکھا، اور اپنی خداداد ذہانت، قوت حافظہ، زبان دانی، دقت نظر اور وسعت مطالعہ کی مدد سے کوشش کی کہ صحت سے قریب تر متن تیار کیا جاسکے۔اس کار تدوین میں ان کی دقیقہ سنجی اور جاں فشانی دیکھنی ہو تو مجموعے کے آخر میں ان حواشی اور تعلیقات کا مطالعہ کرنا چاہیے جو اس اڈیشن کے تقریباً ڈھائی سو صفحات پر محیط ہیں۔

اکتوبر ۱۹۷۷ء میں افغانستان میں حکیم سنائی کا نوسوسالہ جشن منایا گیا۔اس موقع پر کابل یونیورسٹی نے ڈاکٹر صاحب کی اجازت سے مکاتیب سنائی کا نیا اڈیشن شائع کیا۔اس اڈیشن کے شروع میں یونیورسٹی کی آرٹس فیکلٹی کے ڈین پروفیسر میر حسین شاہ اور مجلۂ ادب کے مدیر شاہ علی اکبر شہرستانی کی دو مختصر تمہیدی تحریروں کے بعد ڈاکٹر روان فرہادی کے قلم سے ''آشنائی با سنائی غزنوی'' اور ''پیش گفتار دربارۂ مکاتیب سنائی'' کے عنوان سے ۱۵ صفحات کے دو مقدمے ہیں۔ہندوستانی اڈیشن سے مکاتیب کے متن مع حواشی کا عکس جوں کا توں شامل کیا گیا ہے۔البتہ متن کے بعد تعلیقات کو ازسرنو کمپوز کیا گیا اور ان میں حذف و اختصار سے کام لیا گیا ہے۔مثال کے طور پر ص ۲۶۱ پر مرتب نے علامہ اقبال کے دیوان اسرار و رموز سے گیارہ اشعار کے ساتھ مثنوی معنوی کا ایک شعر بھی نقل کیا تھا،طبع کابل میں یہ سارے اشعار حذف کردیے گئے۔تعلیقات میں یہ اختصار تو شاید کسی درجے میں قابل قبول ہو لیکن طرفہ تماشا یہ ہے کہ ''مقدمۂ مصحح'' کو جو حکیم سنائی کے احوال وآثار، مکاتیب کے قلمی نسخوں کے بارے میں تفصیلات، اس مجموعے کی تدوین میں مرتب کے طریقۂ کار اور حواشی میں استعمال کیے گئے رموز و مختصرات کے بیان پر مشتمل تھا، مکمل طور پر حذف کردیا گیا! اس سلسلے میں شاہ علی اکبر کا یہ بیان کہ ''کتاب مکاتیب سنائی را با حذف و اصلاح مطالبیکہ مستقیماً با موطن سنائی رابطہ نداشت نشر می نمائیم'' (ص سوم) مبہم بھی ہے اور خلاف واقعہ بھی، کہ انہوں نے مقدمۂ مصحح کا کوئی حصہ باقی نہیں

رکھا۔ناشر کے اس تصرف بیجا نے مکاتیب سنائی کے کابل اڈیشن کو ناقص اور غیر معتبر بنادیا ہے۔

پروفیسر نورالحسن انصاری نے اس اڈیشن کے بارے میں ایک جگہ لکھا ہے: ''بعد میں انہیں کچھ اور مکاتیب دستیاب ہوئے جنہیں مرتب کر کے انہوں نے کابل سے شائع کیا'' (۶)۔ یہ بیان غلط فہمی پر مبنی ہے۔ ۷۱ خطوط جو طبع اول میں شائع ہوئے تھے وہی اس اڈیشن میں بھی شامل ہیں، بلکہ جیسا کہ ابھی عرض کیا، جہاں تک مکاتیب کے متن اور حواشی کا تعلق ہے، طبع کابل طبع علی گڑھ کا عکسی اڈیشن ہے۔

حکیم سنائی کے جشن نود سالہ کے موقع پر ایک ہفت روزہ بین الاقوامی سمینار (۱۷۔ ۲۲ اکتوبر) بھی منعقد کیا گیا تھا۔ اس میں ڈاکٹر نذیر احمد صاحب بھی مدعو تھے اور ان کے مقالے کا عنوان تھا: ''بعضے اشعار ناشناختہ شدۂ سنائی''۔ ڈاکٹر صاحب نے اس سمینار کی روداد بھی مرتب کی تھی جو معارف اگست اور ستمبر ۱۹۷۹ء کے شماروں میں شائع ہوئی۔ اس روداد میں ایک جگہ وہ فرماتے ہیں کہ کابل سے واپسی (۲۶ اکتوبر ۱۹۷۷ء) کے بعد ہی انہوں نے مکاتیب پر نظر ثانی کا کام شروع کر دیا تھا''۔ (۷)

اسی سال (۱۹۷۷ء) کے اگست میں راقم نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شعبۂ عربی میں ایم اے میں داخلہ لیا۔ ڈاکٹر نذیر احمد صاحب کو دیکھنے سننے کا اشتیاق بہت دنوں سے تھا۔ مگر میری کم آمیزی اور بغیر کسی تقریب ملاقات کے پیش قدمی سے گریز کی عادت شاید ایک مدت تک بالمشافہ ملاقات سے محروم رکھتی، لیکن حسن اتفاق سے یہ موقع بہت جلد میسر آ گیا۔ ''اردو باغ'' (ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی کے مکان کا نام) میں افطار کی دعوت تھی۔ ڈاکٹر نذیر صاحب اس میں مدعو تھے۔ خلیل صاحب مرحوم نے ازخود ڈاکٹر صاحب سے میرا تعارف کرایا۔ ڈاکٹر صاحب کی سادگی اور انکسار نے مجھے متاثر کیا۔ معلوم ہوا کہ ڈاکٹر صاحب کا دولت کدہ، اردو باغ کے برابر میں ہی ہے۔ پھر کیا تھا، ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں گاہے بہ گاہے حاضری کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ میرا موضوع عربی زبان وادب اور ڈاکٹر صاحب کی گفتگو کا محور فارسی زبان وادب کے مسائل، تازہ مطبوعات، نئے مکشوف قلمی نسخے اور خاص طور پر فارسی میں فرہنگ نویسی۔ فارسی کی میری شد بد اس وقت بھی واجبی سی تھی اور اب بھی یہی حال ہے لیکن ڈاکٹر صاحب کی محققانہ اور معلومات افزا گفتگو ہمیشہ علمی کاموں کے لیے مہمیز کا کام کرتی، ذہن کے دریچے کھلتے اور ولولۂ تازہ ملتا۔ بلکہ کبھی کبھی تو یہ تمنا ہوتی کہ کاش میرا میدان کار بھی

فارسی ادبیات ہوتا۔

مارچ ۱۹۷۸ء کا کوئی دن تھا، معمول کے مطابق ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا تو گفتگو کا سلسلہ ایسا دراز ہوا کہ تین گھنٹے گزر گئے۔ڈاکٹر صاحب مسلسل اپنے واقعات، تجربات اور تازہ تحقیقات و مقالات کا تذکرہ کرتے رہے۔"فکر و نظر" کی ادارت کے علاوہ دیوان حافظ کے نئے اڈیشن کا ذکر کیا جو حال ہی میں ان کی تحقیق سے شائع ہوا تھا اور اس کے سرورق پر ناشر نے ڈاکٹر صاحب کے نام کے ساتھ اپنا نام بھی ثبت کر رکھا تھا۔اسی نشست میں ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ ایران کا ایک ناشر مکاتیب سنائی چھاپنا چاہتا ہے اور وہ کتاب پر نظر ثانی کر رہے ہیں، اسی ضمن میں بعض عربی اقتباسات کی تصحیح و تخریج کی ضرورت ہے۔ میں نے بخوشی آمادگی ظاہر کی تو ڈاکٹر صاحب نے ایک فہرست میرے حوالے کی جو عربی کے ان اشعار، ضرب الامثال اور عرب ادیبوں کے کلام سے نثری اقتباسات پر مشتمل تھی جن کے حوالے ڈاکٹر صاحب کو اس وقت تک نہ مل سکے تھے۔راقم اپنے محدود مطالعے اور جستجو کی روشنی میں جو حوالے تلاش کر سکا وہ فراہم کر دیے اور جن کا متن غلط تھا ان کی تصحیح کر دی۔ کچھ اقتباسات ایسے بھی تھے جن کی تصحیح و تخریج کی کوشش کامیابی سے ہم کنار نہ ہو سکی۔

ڈاکٹر صاحب نے نظر ثانی مکمل کی۔ اس عرصے میں مکاتیب سنائی کا کوئی نیا قلمی نسخہ تو دریافت نہ ہو سکا، البتہ برلن میں محفوظ ایک مجموعے میں سنائی کے دو خطوط ملے جو اگرچہ "مکاتیب سنائی" میں شامل ہیں لیکن برلن کا یہ نسخہ قدیم ہے اور ۵۴۳ھ میں اس کی کتابت ہوئی ہے۔اس طرح "یہ دونوں خط سنائی کے کلام کے سب سے قدیم مکتوب ہیں" (۸)۔بعض اور متون بھی ملے جن کے مقابلے سے مکاتیب سنائی کے متن کی تصحیح میں مدد ملی اور بعض توضیحی امور کی تصدیق ہوئی۔ دوسرے لفظوں میں مکاتیب کی تعداد سابق بدستور رہی، البتہ تخریج و تحشیہ میں خاصے مفید اضافے ہوئے۔ اِدھر نئے اڈیشن کی تیاری مکمل ہوئی اور اُدھر ایران میں انقلاب آ گیا جس نے ساری بساط الٹ کر رکھ دی۔ چنانچہ مدت دراز تک کتاب کی اشاعت کی کوئی سبیل پیدا نہ ہو سکی۔ڈاکٹر صاحب کے قلم سے معارف میں کابل سمینار کی جو روداد شائع ہوئی اس میں وہ رقم طراز ہیں:

> "....غرض ان امور کی روشنی میں مکاتیب سنائی کا تیسرا ایڈیشن تیار ہے۔انشاءاللہ طباعت کے معقول ذرائع کے حصول کے بعد اس کی اشاعت کا

انتظام ہوجائے گا‘‘۔(۹)

اشاعت کا انتظام ہوا لیکن بہت تاخیر سے۔ڈاکٹر صاحب نے جیسا کہ ذکر کیا سنہ ۱۹۷۹ء، میں جب یہ روداد قلم بند کی تھی مکاتیب کا نیا اڈیشن مرتب کرلیا تھا مگر اس کی طباعت میں کم وبیش ۲۱ برس لگ گئے اور آخر کار وہ ایرج افشار کی توجہ سے ’’بنیاد موقوفات دکتر محمود افشار‘‘ کے سلسلۂ مطبوعات کے تحت ۱۳۷۹ شمسی مطابق ۲۰۰۰ء میں منظر عام پر آیا۔

راقم اس دوران ۱۹۸۲ء میں مدینہ منورہ آ گیا تھا۔سالانہ تعطیلات میں وطن جانا ہوتا تو دو ایک روز کے لیے علی گڑھ بھی جاتا اور ڈاکٹر صاحب سے بھی نیاز حاصل کرتا۔اگست ۲۰۰۳ء میں سلام کرنے حاضر ہوا تو انہوں نے اس ایرانی اڈیشن کا ایک نسخہ عنایت فرمایا۔’’مقدمۂ چاپ سوم‘‘ پر نظر پڑی تو ڈاکٹر صاحب کی عالی ظرفی اور خورد نوازی دیکھ کر سخت حیرت ہوئی کہ ایک عرصے قبل مکاتیب کی جو حقیر سی طالب علمانہ خدمت انجام دی تھی، انہوں نے مقدمے میں اس کا خاص طور پر ذکر فرمایا تھا۔

کچھ دنوں قبل مکاتیب کا یہ نسخہ ایک ضرورت سے اپنے ساتھ ریاض لایا تو ورق گردانی کے دوران متعدد ایسے عربی اشعار اور فقرے نظر آئے جن کی تخریج میں پہلے ناکامی ہوئی تھی اور اسی بنا پر ان کے متن کی بعض غلطیوں کی تصحیح بھی نہ ہوسکی تھی، لیکن اب وہ راقم کے لیے معروف تھے اور دوران مطالعہ مختلف مآخذ میں اس کی نگاہ سے گزر چکے تھے۔مناسب معلوم ہوا کہ مکاتیب سنائی سے شغف رکھنے والوں کی خدمت میں ان اقتباسات کے بارے میں ایک گزارش پیش کردی جائے۔۱۹۷۸ء میں ڈاکٹر صاحب کی نوازش سے مکاتیب کی خدمت کا موقع ملا تھا اور اب چالیس سال بعد اس کا تتمہ لکھنے کی سعادت حاصل ہورہی ہے۔ڈاکٹر صاحب نے جس طرح اپنی زندگی میں گذشتہ کاوش پر خوشی کا اظہار فرمایا تھا، امید ہے ان کی روح اس تتمے اور ضمیمے سے بھی مسرور ہوگی۔

آیندہ صفحات کا موضوع بنیادی طور پر اقتباسات ہیں لیکن بعض اور تصحیفات اتفاقاً نظر آ گئیں تو ان کی جانب بھی توجہ دلائی گئی۔

۱۔ص ۳۹: مصنف نے دیباچے کی ابتدائی سطریں عربی میں لکھی ہیں۔ان میں ایک جملہ جو صرف حبیب گنج کے قلمی نسخے میں آیا ہے اس طرح ہے:

’’أکرم بعطف العباد بالنعم السابقة و الحکمة البالغة‘‘

اس جملے میں لفظ ''السابقة'' کا کوئی محل نہیں۔ صحیح لفظ ''السابغة'' (غین سے) ہے۔ مخطوطات میں ان دونوں لفظوں میں کاتب اکثر غلطی کرتے ہیں۔ سابغ کے اصل معنی کشادہ اور فراخ کے ہوتے ہیں۔ کشادگی فراوانی چاہتی ہے، اس بنا پر یہ لفظ کامل اور فراواں کے معنی میں بھی استعمال ہوا۔ سورہ لقمان (۲۰) میں ارشاد ہے:

و أسبغ عليكم نعمه ظاهرة و باطنة اور تم پر اپنی ظاہری اور باطنی نعمتیں پوری کر دیں۔

سجع کا تقاضا بھی یہی ہے کہ ''البالغة'' کے مقابلے میں ''السابغة'' ہو۔ نعمت سابغۃ اور حکمت بالغہ کے سجع کی بعض مثالیں ملاحظہ ہوں:

۱۔ کتاب الحیوان ۱:۲۱۷ میں جاحظ (ف ۲۵۵ھ) کی ایک عبارت کا ٹکڑا ہے:

''من عجيب التدبير و النعمة السابغة و الحكمة البالغة''

۲۔ ابن حمدون (ف ۵۶۲ھ) نے اپنے تذکرے ۶: ۳۲۵ میں ایک انشا پرداز کے قلم سے لکھا صلح نامہ نقل کیا ہے، اس کے دیباچے کا پہلا جملہ یہ ہے:

''الحمد لله ذي النعمة السابغة و الحكمة البالغة''

۳۔ لسان الدین ابن الخطیب (ف ۷۷۶ھ) نے ریحانۃ الکتاب ۱:۱۰۱ میں اپنی ایک تحریر کا آغاز اس جملے سے کیا ہے:

''الحمد لله الذي له الحكمة البالغة و النعمة السابغة''

مذکورہ بالا مثالوں میں دونوں لفظ واحد کی صورت میں آئے ہیں۔ جمع کی دو مثالیں بھی ملاحظہ ہوں:

۱۔ حضرت علیؓ کے مواعظ کا ایک نمونہ ابن درید (ف ۳۲۱ھ) نے المجتنیٰ: ۲۰ میں نقل کیا ہے۔ اس میں وہ فرماتے ہیں:

''و آثركم بالنعم السوابغ، و تقدم إليكم بالحجج البوالغ''

۲۔ ابو منصور عبدالقاہر بغدادی (ف ۴۲۹ھ) کی کتاب اصول الدین کا آغاز اس جملے سے ہوا ہے:

''الحمد لله ذي الحكم البوالغ و النعم السوابغ و النقم الدوامغ''

ان مثالوں پر غور کریں تو مکاتیب سنائی کے زیر نظر جملے میں ایک اور سقم بھی نظر آئے گا اور اس کا ذمہ دار بھی کاتب ہے۔ ''النعم'' جمع ہے اور ''الحكمة'' واحد ہے۔ حسنِ کلام کا تقاضا یہ ہے کہ

دونوں لفظ جمع ہوں یا دونوں واحد۔ میرا خیال ہے کہ "بالنعمة" کو کاتب نے "بالنعم" لکھ دیا ہے۔ حبیب گنج کا نسخہ غلطیوں سے پر ہے۔ اس کے بارے میں ڈاکٹر صاحب نے مقدمے (ص ۲۶) میں لکھا ہے:

"اما خیلی مغلوط است وظاھراً کاتب قدری بیسواد یا کم سواد بودہ"۔

۲۔ ص ۴۵: نامۂ اول میں ایک جملہ یوں آیا ہے:

"کاس رحیق وجام تحقیق بردست اکیاسِ اناس نہادہ"۔

لفظ اکیاس کے معنی ڈاکٹر صاحب نے حاشیے میں "کیسه ھای زر" لکھے ہیں جو سیاق کلام میں کسی طرح موزوں نہیں۔ یہاں "اکیاس" کا لفظ "کیس" بروزن چیز کی جمع نہیں ہے، بلکہ "کیّس" بروزن جید بایای مشددہ مکسورہ اور "کیْس" بروزن خیر بایای ساکنہ کی جمع ہے اور اس کے معنی زیرک اور دانا کے ہیں۔

۳۔ ص ۴۷: نامۂ اول ہی میں "شعر" کے عنوان سے دو مصرعے اس طرح درج ہیں:

لا بشر أنت ولا مضغة ولاعلی مهنّد من سيوف الله مسلول

"شعر" کا عنوان جامعہ عثمانیہ کے نسخے کے سوا دوسرے تمام نسخوں میں آیا ہے، حالانکہ دونوں مصرعوں میں کسی قسم کا ربط نہیں۔ دوسرا مصرعہ تو کعب بن زہیر کے مشہور قصیدے "بانت سعاد" کا ہے اور اس کا مصرعۂ اولی جیسا کہ حواشی میں مذکور ہے یہ ہے:

إن الرسول لسيف يستضاء به

لیکن اس سے پہلے جو عبارت مصرعے کی صورت میں لکھی گئی ہے وہ حضرت عباس بن عبدالمطلبؓ کے ایک شعر سے ماخوذ ہے اور لفظ "علی" اس عبارت میں غلط ہے۔ صحیح لفظ "عَلَقٌ" ہے۔ مکمل شعر حسب ذیل ہے:

ثم هبطت البلادَ لا بشرٌ أنت ولامضغة ولا عَلَقُ

کعب بن زہیر کا قصیدہ بحر بسیط میں ہے اور حضرت عباس کا شعر جو آٹھ ابیات کے نعتیہ قطعے کا حصہ ہے، بحر منسرح میں۔ حضرت عباس کا یہ قطعہ حدیث، سیرت اور ادب کی بہت سی کتابوں میں نقل ہوا ہے۔ مثال کے طور پر ملاحظہ ہو:

ابن مندہ (ف ۳۶۵ھ) کی معرفۃ الصحابۃ ۱:۵۲۱۔طبرانی (ف ۳۶۰ھ) کی المعجم الکبیر ۴: ۲۱۳۔مستدرک حاکم (ف ۴۰۵ھ) ۳:۳۶۹۔قاضی عیاض (ف ۵۴۴ھ) کی الشفا ۱:۴۶۷۔ ابوالقاسم زجاجی (ف ۳۳۷ھ) کی امالی:۶۵۔

۴۔ص ۵۷: نامۂ سوم میں ایک شعر ہے:

أصبحتُ أمسک عن أوصاف نعمته عجزًا وينطق عن آثارها حالي

یہ شعر ابوالفرج الببغاء (ف ۳۹۸ھ) کے ایک قصیدے کا ہے جسے ابومنصور ثعالبی (ف ۴۲۹) نے یتیمۃ الدھر ۱:۲۲۷ اور خطیب بغدادی (ف ۴۶۳ھ) نے تاریخ بغداد ۱۲:۲۶۰ میں نقل کیا ہے۔سعود محمود عبدالجابر نے شاعر مذکور کا جو دیوان مرتب کیا ہے اس میں یہ قصیدہ انہیں دونوں کتابوں کے حوالے سے شامل کیا ہے (ص ۱۳۸)۔مآخذ کی روایت ''أصبحت'' کے بجائے ''فصرت'' ہے۔

۵۔ص ۵۹: یہ عبارت بھی نامۂ سوم کی ہے:

''....کہ وعدۂ او در خلاف چون درختِ خلاف باشد کہ خضرۃ فی العین ولا ثمرۃ فی الیمین''۔

عربی فقرہ بدیع الزمان ہمدانی صاحب مقامات (ف ۳۹۸ھ) کے ایک مکتوب سے ماخوذ ہے، بلکہ اس سے پہلے کا فارسی جملہ بھی اسی مکتوب سے مستفاد ہے۔بدیع الزمان کی اصل عبارت یہ ہے:

''ما أشبه وعدَ الشيخ في الخلاف إلا بشجر الخلاف:

خضوة في العين ولا ثمر في اليدين''

ملاحظہ ہو: رسائل بدیع الزمان: ۳۳۲، ثعالبی (ف ۴۲۹ھ) نے یتیمۃ الدھر ۴:۳۰۹ میں بدیع الزماں کے رسائل سے جو منتخب عبارتیں نقل کی ہیں ان میں یہ فقرہ بھی ہے۔ابن معصوم مدنی (ف ۱۱۱۹ھ) نے انوار الربیع فی انواع البدیع ۶:۳۵۶ میں سجع کے عمدہ نمونوں میں اس فقرے کا بھی انتخاب کیا ہے۔

۶۔ص ۵۹ کے آخر میں ایک شعر اس طرح درج ہے:

لئن قصرت يداي عن الجزاء فما قصر اللسان على الثناء

دوسرے مصرعے میں جیسا کہ حاشیے میں لکھا ہے، ''على'' کے بجائے ''عن'' درست

ہے۔ابن المستوفی اربلی (ف ۶۳۷ھ) نے تاریخ اربل ۱: ۲۰۰ میں لکھا ہے کہ ماہ ربیع الاول ۶۲۲ھ میں عبدالرشید آملی صوفی نے اسے اپنے دو شعر سنائے تھے۔ پہلا شعر تو یہی ہے جو مکاتیب سنائی میں آیا ہے، دوسرا حسب ذیل ہے:

أنالَ حبيبكم خيراً مليك أذاق عدوّكم سوءَ البلاء

اس مقام پر تاریخ اربل کے مخطوطے کے کاتب نے ابن الشعار موصلی (ف ۶۵۴ھ) کے حوالے سے یہ نوٹ لکھا ہے کہ پہلا شعر محمد بن عبدالعزیز نیلی نیشاپوری (ت ۴۳۶ھ) کا ہے، موخرالذکر خراسان کے جلیل القدر شافعی فقیہ ہونے کے ساتھ صاحب دیوان شاعر تھے۔ حالات کے لیے ملاحظہ ہو: سیر اعلام النبلاء ۱۷: ۵۹۰، طبقات الشافعیۃ الکبری ۴: ۱۷۸۔

۷۔ص ۶۲: نامۂ چہارم کے شروع میں سنائی نے یہ حدیث نقل کی ہے:

"من عامل الناس فلم يظلمهم ، وحدثهم فلم يكذبهم ، ووعدهم فلم يخلفهم ، فهو ممن كملت مروءته ، ووجبت أخوته ، وحرمت غيبته"۔

پہلی بات تو یہ کہ متن میں "كملت مروءته" کے بعد ایک جملہ "وظهرت عدالته" ساقط ہے، اور یہ غلطی کاتبوں کی ہے۔ دلیل یہ ہے کہ مصنف نے آگے دوسرے صفحے پر خود اس جملے کا ذکر کیا ہے اور حدیث کے تمام مآخذ میں بھی یہ جملہ آیا ہوا ہے۔ یہ حدیث خطیب بغدادی (ت ۴۶۳ھ) کی الکفایۃ: ۷۸ میں حضرت حسین بن علیؓ سے مروی ہے، جب کہ شہاب قضاعی (ت ۴۵۴ھ) نے اپنی مسند ۱: ۲۲۲، اور شیرویہ دیلمی (ت ۵۰۹ھ) نے الفردوس ۳: ۴۹۹ میں حضرت علیؓ سے۔ سیوطی (ت ۹۱۱ھ) نے الزیادات علی الموضوعات ۲: ۵۷۸ میں اس حدیث کو موضوع حدیث کے طور پر ذکر کیا ہے۔ مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: سلسلۃ الاحادیث الضعیفۃ والموضوعۃ ۷: ۲۱۵۔

۸۔ص ۶۴: اسی مکتوب میں یہ شعر آیا ہے:

والحق أبلج لا يخفى معامله كالشمس تظهر في نور وإشراق

شعر کے متن میں "معامله" کا لفظ تصحیف ہے۔ صحیح "معالمه" ہے۔ ممکن ہے یہ غلطی طباعت کی ہو جو طبع اول سے آئی ہو۔ یہ شعر متعدد عربی لغات میں نقل ہوا ہے لیکن شاعر کا نام کہیں مذکور

نہیں۔ نیز سارے مآخذ میں قافیہ ''إبلاج'' ہے اور یہ شعر (ب ل ج) کے مادے میں آیا ہے۔ گویا بنائے استشہاد ہی لفظ إبلاج ہے۔ إبلاج اور إشراق ہم معنی ہیں اسی وجہ سے قافیے میں سہواً تصرف ہوگیا ہے۔ راقم کے پیش نظر جو لغت ہیں ان میں اس شعر کا ذکر سب سے پہلے ابو علی قالی (ف ۳۵۶ھ) کی البارع: ۶۵۲ میں ملتا ہے، اس کے بعد ابو منصور ازہری (ف ۳۷۰ھ) کی تہذیب اللغۃ ۱۱:۶۸ میں۔ نیز ملاحظہ ہو لسان العرب ۲:۳۱۶، اور تاج العروس ۵:۴۲۸۔

۹۔ص ۶۵: ''العلائق هي العوائق عن الحقائق''۔ یہ فقرہ ثعالبی (ف ۴۲۹ھ) نے الاعجاز والایجاز: ۱۱۴ میں ابو العباس الاقلیدسی کے ملفوظ کے طور پر نقل کیا ہے۔

۱۰۔ص ۶۶: اسی مکتوب میں یہ مصرعہ بھی آیا ہے:

غاب الأمير فغاب الخير عن بلد

یہ متنبی کے شعر کا پہلا مصرعہ ہے۔ مصرعہ ثانی یہ ہے:

كادت لفقد اسمه تبكي منابره

ملاحظہ ہو: دیوان المتنبی: ۳۷۔

۱۱۔ص ۶۶: اسی مکتوب میں حسب ذیل مصرعہ بھی آیا ہے:

وأي نعيم لا يكدّره الدهر

ڈاکٹر صاحب نے اس مصرعے کے لیے تعلیقات میں جن کتابوں کے حوالے دیے ہیں ان میں سے بعض میں اس کا مصرعہ اولی

فلما أضاء الصبح فرّق بيننا

اور مرصاد العباد میں اس شعر کے ساتھ ایک اور شعر بھی نقل ہوا ہے۔ ملاحظہ ہو: تعلیقات ۲۶۵۔۲۶۶۔

شیخ بہاء الدین عاملی (ف ۱۰۳۱ھ) نے المخلاۃ: ۴۸۹ میں چار ابیات کا قطعہ نقل کیا ہے اور اسے مشہور عباسی شاعر مسلم بن الولید (ف ۲۰۸ھ) کی جانب منسوب کیا ہے۔ زیر بحث شعر اس قطعے کا آخری شعر ہے۔ المخلاۃ ہی کے حوالے سے ڈاکٹر سامی الدہان نے ان اشعار کو دیوان مسلم کے ضمیمے (ص ۳۱۷) میں شامل کیا ہے۔ یہ قطعہ عبداللہ بن محمد زوزنی (ف ۴۲۱ھ) نے حماسۃ الظرفاء ۲:۲۰،

اورابن ایدمر (ف ۷۱۰ھ) نے الدرالفرید میں بھی نقل کیا ہے، مگر شاعر کا نام ذکر نہیں کیا۔

۱۲۔ص ۲۳۷ نامۂ پنجم: ''خل الطريق لمن لا يفيق''۔

مشہور جاہلی حکیم اکثم بن صیفی نے حیرہ کے بادشاہ نعمان بن المنذر کو بعض نصائح لکھے تھے، یہ فقرہ انہیں میں آیا ہے۔ ابوالشیخ اصبہانی (ت ۳۶۹ھ) نے اپنی کتاب الامثال فی الحدیث النبوی ۱: ۲۸۱ کے آخر میں یہ نصائح نقل کیے ہیں۔

۱۳۔ص ۹۲ نامۂ ہفتم: ''سكيت في بطن عفريت''۔

مکاتیب سنائی کے سارے نسخوں میں ''بطن'' کا لفظ آیا ہے جو ''بطش'' کی تصحیف ہے۔ اس کہاوت کے لیے ملاحظہ ہو: ابوحیان توحیدی (ف ۴۱۴ھ) کی البصائر والذخائر ۲: ۱۴۰، اور زمخشری (ف ۵۸۲ھ) کی ربیع الابرار ۲: ۱۴۶۔

۱۴۔ص ۹۲: اسی مکتوب میں یہ مصرعہ بھی آیا ہے:

''نظر المريض إلى وجوه العوّاد''

یہ مصرعہ نابغہ ذبیانی کا ہے جیسا کہ تعلیقات: ۲۸۲ میں مذکور ہے۔ لیکن مکاتیب کے متن میں ''العوّاد'' غلط ہے اور اس کی وجہ سے مصرعہ بحر سے خارج ہو گیا ہے۔ صحیح لفظ ''العوّد'' ہے۔ تعلیقات میں ''العوّذ'' ذال معجمہ سے طباعت کی غلطی ہے۔ دیوان نابغہ کی روایت ''نظر السقيم'' ہے لیکن بعض مآخذ میں مکاتیب کی طرح ''نظر المريض'' بھی آیا ہے، مثلاً دیکھیے: ابن قتیبہ (ف ۲۷۶ھ) کی عیون الاخبار ۲: ۱۸۹، اور زمخشری (ف ۵۸۲ھ) کی المستقصی ۲: ۳۶۸۔

۱۵۔ص ۹۲: گذشتہ مصرعہ کے بعد ہی دوسری سطر میں حسب ذیل مصرعہ آیا ہے۔

''نظر التيوس إلى شفاء الجاذر''

حاشیے میں ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے کہ جامعہ عثمانیہ اور انڈیا آفس لائبریری کے نسخوں میں ''الجازر'' ہے۔ یہی درست ہے، ذال سے الجاذر کے معنی اگرچہ کاٹنے والے کے ہیں لیکن یہ لفظ قصاب کے معنی میں معروف نہیں اور روایت کے بھی خلاف ہے۔ ''شفاء'' کا لفظ بھی ''شفار'' کی تصحیف ہے۔ ''شفار الجازر'' کے معنی ہیں: قصاب کی چھریاں۔ حاشیے میں مجمع الامثال کا حوالہ ہے اور اس میں یہ مصرعہ درست ہے۔ زمخشری کی المستقصی ۲: ۳۶۸ میں یہ مصرعہ اور گذشتہ مصرعہ دونوں

ضرب المثل کے طور پر یکے بعد دیگرے نقل ہوئے ہیں۔

زیر بحث مصرعہ جو دراصل مصرعۂ ثانی ہے عبدالرحمٰن بن حسان بن ثابت (ف ۱۰۴ھ) کے ایک قصیدے کا ہے جو عبدالرحمٰن بن الحکم کی ہجو میں کہا گیا ہے۔اس قصیدے کا سب سے قدیم ماخذ زبیر بن بکار (ف ۲۵۶ھ) کی الموفقیات:۲۲۲ ہے۔اس میں شعر کا مصرعۂ اولی اس طرح نقل ہوا ہے:

لم تنظرون إذا هدرتُ إليكم

قصیدے کے دوسرے مآخذ میں الاغانی ۱۵: ۹۱، حماسۃ البحتری ۲: ۲۵۲، اور الحماسۃ البصریۃ ۳: ۱۳۶۰ قابل ذکر ہیں۔مصرعۂ اولی کے الفاظ میں کہیں کہیں اختلاف ہے مگر زیر بحث مصرعے میں جو ضرب المثل ہے کوئی اختلاف نہیں۔تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: شعر عبدالرحمٰن بن حسان مرتبہ عانی:۲۵،اور مرتبہ الرشود:۶۰۔

۱۶۔ص ۹۲:"العقرب إلى الشر أقرب"

یہ جملہ بدیع الزماں الہمدانی (ف ۳۹۸ھ) کے ایک خط سے ماخوذ ہے جو ابونصر بن ابی زید کے نام لکھا گیا ہے۔اس خط کا اقتباس ثعالبی (ف ۴۲۹ھ) نے یتیمۃ الدہر ۴: ۲۹۹،اور سحر البلاغۃ: ۱۹۸ میں نقل کیا ہے۔

۱۷۔ص ۱۱۸: نامۂ دہم میں حسب ذیل مصرع آیا ہے:

سرًّا بسرٍّ و إضمارًا بإضمار

یہ مصرعہ جو دوبارہ ص ۱۳۹ پر بھی آیا ہے دراصل مصرعۂ ثانی ہے۔اس کا مصرعۂ اولی یہ ہے:

لبيك لبيك من قربٍ و من بعدٍ

رشید الدین میبدی نے کشف الاسرار (تاریخ تصنیف ۵۲۰ھ) ۸: ۲۶۴،اور ملا علی قاری (ف ۱۰۱۴ھ) نے مرقاۃ المفاتیح ۱: ۵۶ میں شاعر کا نام لیے بغیر دو شعر نقل کیے ہیں،ایک یہ اور دوسرا:

يامن إلى وجهه حجّي و معتمري　　إن حجَّ قوم إلى ترب و أحجار

ثعالبی (ف ۴۲۹ھ) نے یتیمۃ الدہر:۶۱ میں بغداد کے ایک بزرگ صوفی شاعر ابوبکر العنبری کی چار ابیات کا ایک قطعہ نقل کیا ہے جس کا پہلا شعر یہی "يامن إلى وجهه..." ہے۔اس سے بظاہر یہ خیال ہوتا ہے کہ "لبيك لبيك..." والا شعر بھی ابوبکر العنبری ہی کا ہے اگر چہ ثعالبی نے اسے

نقل نہیں کیا ہے۔دوسرا احتمال یہ ہے کہ کسی اور شاعر نے ابوبکر العنبری کے شعر ''یا من إلی و جهه...'' کی تضمین کی ہو۔مکاتیب سنائی میں جو مصرعہ آیا ہے اسے نظام الدین نیشاپوری (ف ۸۵۰ھ) کی تفسیر غرائب القرآن ۳: ۱۳۲، اور اسماعیل حقی (ف ۱۱۲۷ھ) کی روح البیان ۱: ۴۳۲ و ۳: ۲۵۵ میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

قابل ذکر بات یہ ہے کہ کشف الاسرار ۱: ۳۶۶ میں ''یا من إلی و جهه...'' والے شعر کے بعد اسی مضمون کا سنائی کا یہ شعر نقل کیا ہے:

هر کسی محراب دارد هر سوئی　　باز محرابِ سنائی کوی تو

دیوان سنائی مرتبہ مدرس رضوی: ۱۰۰۴ میں ''هست محرابِ سنائی'' ہے۔

۱۸۔ص ۱۲۰ نامۂ یازدہم: ''کل عسر إذا عسرت یهون''

جامعہ عثمانیہ اور انڈیا آفس لائبریری کے نسخوں میں ''عسر'' کے بجائے ''عسرة'' ہے اور یہی درست ہے کیونکہ فعل ''عسرت'' کی تانیث پر سارے نسخے متفق ہیں، اور اسی بنا پر ''یهون'' کے بجائے ''تهون'' ہونا چاہیے۔

۱۹۔ص ۱۲۲: اسی مکتوب میں حسب ذیل عبارت آئی ہے:

''فصحا و بلغا گفته اند: الدخول بین الأحبة تحول، الأمطار تمنع الافطار''۔

اس عبارت میں دو غلطیاں ہیں۔پہلے جملے میں ''الدخول'' تصحیف ہے ''الوحول'' کی۔ ''وحل'' کے معنی کیچڑ کے ہیں، ''وحول'' اس کی جمع ہے اور اسی وجہ سے فعل ''تحول'' مونث ہے۔دوسرے جملے میں ''الافطار'' تصحیف ہے ''الأوطار'' کی جو ''وطر'' کی جمع ہے۔''وطر'' کے معنی ضرورت اور حاجت کے ہیں۔

مشہور محدث ابوطاہر السِّلَفی (سین مکسورہ کے ساتھ) متوفی سنہ ۵۷۶ھ معجم السفر: ۱۵۰ میں لکھتے ہیں کہ ابومحمد عبداللہ بن الحسن بن عشیر العبدری کی وصیت کے مطابق ان کی نماز جنازہ انہوں نے یعنی سِلفی نے پڑھائی، لیکن انتقال کے روز سخت ژالہ باری ہوئی جس کی وجہ سے زیادہ لوگ جنازے میں شریک نہ ہو سکے۔اس کے بعد فرماتے ہیں:

”فالو حول تحول، ونزول الأمطار يمنع عن قضاء الأوطار“

سِلفی کی اس عبارت میں وہ دونوں جملے آئے ہیں جن کے لیے سنائی نے فصحا و بلغا کا حوالہ دیا ہے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ جمال الدین قفطی (ف ۶۴۶ھ) نے اِنباہ الرواۃ ۲: ۱۱۵ میں عبدری کے حالات معجم السفر سے نقل کیے ہیں مگر جلد بازی میں یہ لکھ گئے کہ ژالہ باری کی وجہ سے سِلفی ان کی نماز جنازہ نہ پڑھا سکے!

۲۰۔ص ۱۲۲: ”كلّي بكلّك مشغول“۔

ڈاکٹر صاحب نے تعلیقات ۳۴۰ میں شرح تعرّف اور کشف الاسرار سے ایک حکایت نقل کی ہے جس میں یہ جملہ آیا ہوا ہے۔ راقم یہاں یہ اضافہ کرنا چاہتا ہے کہ ابوعلی القالی (ف ۳۵۶ھ) نے امالی ۱: ۲۱۷ میں ابوبکر ابن الانباری (ف ۳۲۸ھ) کے حوالے سے ابراہیم بن المہدی (ف ۲۲۴ھ) کے تین اشعار نقل کیے ہیں جن میں دوسرا شعر حسب ذیل ہے:

ما زلت مذ كلفت نفسي بحبكم كلّي بكلّك مشغول و مرتهن

ابوالفرج الاصفہانی (ف ۳۵۶ھ) نے بھی الاغانی ۱۰: ۱۸۳ میں یہ ابیات نقل کی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے جو حکایت ذکر کی ہے اسے ابن الجوزی (ف ۵۹۷ھ) نے بھی بحر الدموع: ۸۹ میں لوامع انوار القلوب کے حوالے سے نقل کیا ہے۔ موخر الذکر کتاب کے مصنف شافعی فقیہ عزیزی بن عبدالملک (ف ۴۹۴ھ) ہیں۔ کتاب کے متعدد قلمی نسخے کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔ میرے سامنے کتب خانہ محمودیہ مدینہ منورہ کا نسخہ ہے۔ یہ حکایت اس کے ورق ۴۷/ب۔۴۸/أ پر مذکور ہے۔

۲۱۔تعلیقات: ۲۴۷۔۲۴۹، ۳۲۵۔۳۲۶، دیباچۂ مصنف میں ص ۴۱ پر درج ذیل مصرعہ آیا ہے:

وللأرض من كأس الكرام نصيب

تعلیقات کے مندرجہ بالا صفحات میں اس کی تخریج و توضیح کی گئی ہے۔ یہ مصرعہ ثانی ہے، اس کا مصرعۂ اولی یہ ہے:

شربنا فأهرقنا على الأرض فضله

احیاء العلوم میں امام غزالی (ف ۵۰۵ھ) نے اس شعر کے ساتھ ایک اور شعر بھی نقل کیا ہے جس کا حوالہ ڈاکٹر صاحب نے تعلیقات میں ص ۲۴۷ پر دیا ہے۔ اصل شعر کا قدیم ترین حوالہ جو میری نظر سے گزرا وہ حمزہ بن الحسن الاصفہانی کی کتاب الامثال الصادرة عن بیوت الشعر: ۶۲ ہے۔ حمزہ کا انتقال ۳۵۱ھ کے بعد اور ۳۶۰ھ سے قبل ہوا۔ ابوسہل زوزنی (ف تقریباً ۴۴۵ھ) نے قشر الفسر: ۲۸۱ میں متنبی (ف ۳۵۴ھ) کے شعر:

یُروي صدی الأرض من فضلات ما شربوا محضُ اللقاح و صافی اللون سلسالُ

کو اس شعر کا ہم مضمون قرار دیا ہے۔ مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو راقم کا مضمون "غبار خاطر میں عربی اشعار۔ تخریج و تصحیح کے مسائل"، معارف اکتوبر ۲۰۱۳ء، ص ۲۶۷۔

۲۲۔ تعلیقات ۲۶۳۔ نامۂ چہارم میں ص ۶۵ پر یہ مصرع آیا ہے:

قلیلک لا یقال له قلیل

اس کا پہلا مصرع یہ ہے:

قلیل منک یکفینی ولکن

ڈاکٹر صاحب نے تعلیقات: ۲۶۴ میں اس شعر کے لیے تاریخ یمینی کا حوالہ دیا ہے۔ محمد بن عبدالجبار العتبی (ف ۴۲۷ھ) نے کتاب مذکور: ۲۶۲ میں امیر ابونصر احمد بن علی المیکالی (ف ۴۰۶ھ) کا ایک خط نقل کیا ہے جو امیر شمس المعالی قابوس بن وشمگیر (ف ۴۰۳ھ) کے نام ہے اور اس کا خاتمہ اسی شعر پر ہوا ہے۔ غالباً اسی بنیاد پر محمد بن ایدمر (ف ۷۱۰ھ) نے الدر الفرید ۸:۳۵۶ میں اور ان کی تقلید میں عبدالرحیم عباسی (ف ۹۶۳ھ) نے معاہد التنصیص ۳:۲۵۹ میں یہ شعر امیر ابونصر میکالی کی طرف منسوب کر دیا، حالانکہ امیر ابونصر کے مکتوب میں اس کی صراحت نہیں ہے کہ یہ شعر انہیں کا ہے۔ دوسری طرف محمد بن احمد عمیدی (ف ۴۳۳ھ) نے الابانة عن سرقات المتنبی: ۲۰۶ میں اس شعر کو متنبی کے مندرجہ ذیل شعر کا ماخذ بتایا ہے:

وقنعت باللقیا و أول نظرة إن القلیل من المحب کثیر

اگر یہ درست ہے تو اس شعر کا زمانہ متنبی (ف ۳۵۴ھ) سے پہلے کا ہونا چاہیے۔ مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو راقم کا محولہ بالا مضمون ص ۲۵۳۔

مضمون کے آخر میں یہ عرض کرنا ہے کہ مکاتیب سنائی کے بعض عربی اقتباسات کے حوالے اب بھی نہیں مل سکے اور بعض کا متن بھی مغشوش ہے و فوق کلِّ ذی علم علیم۔

حواشی

(۱) معارف اپریل ۲۰۰۳ء کے شمارے میں ص ۳۱۶ پر تبصرہ نگار نے اس اڈیشن کا سنہ طباعت ۱۹۴۲ء لکھا ہے جو درست نہیں ہے۔ (۲) مکاتیب سنائی کے اسلوب کے مفصل تحلیلی جائزے کے لیے ملاحظہ ہو: ''سبک شناسی مکاتیب سنائی غزنوی، نمائندۂ نثر دورۂ گذار'' از ریحانہ داوودی، سید مہدی زرقانی، محمد جواد مہدوی؛ کہن نامۂ ادب پارسی، پژوہش گاہ علوم انسانی و مطالعات فرہنگی، تہران، سال ہفتم، شمارۂ اول، بہار ۱۳۹۵ ش، ص ۵۱۔۷۲۔ (۳) مقدمۂ مصحح، طبع علی گڑھ، ص ۳۵؛ وطبع ایران، ص ۳۳۔ (۴) ڈاکٹر صاحب کی صاحبزادی ریحانہ خاتون نے کارنامۂ نذیر: ۸۸ میں لکھا ہے کہ مکاتیب سنائی کی طبع کابل موزہ بریطانیہ، دانش گاہ حیدرآباد اور دانش گاہ علی گڑھ کے تین نسخوں پر مبنی ہے۔ یہ اطلاع درست نہیں ہے۔ طبع کابل کا متن جیسا کہ آگے معلوم ہوگا طبع علی گڑھ کا عکس ہے اور طبع علی گڑھ کی بنیاد چار نسخوں پر ہے۔ (۵) مقدمۂ مصحح، طبع علی گڑھ، ص ۲۸؛ طبع ایران ص ۲۸۔ (۶) کارنامۂ نذیر: ۶۵۔ (۷) ماہنامہ معارف، شمارہ اگست ۱۹۷۹ء، ص ۱۴۵۔ (۸) ماہنامہ معارف، شمارہ ستمبر ۱۹۷۹ء، ص ۱۹۹۔ (۹) مرجع سابق، ص ۲۰۰۔

فہرست مآخذ

(۱) الابانۃ عن سرقات المتنبی، محمد بن احمد عمیدی، تحقیق ابراہیم دسوقی، دار المعارف، قاہرہ ۱۹۶۱ء۔ (۲) احیاء العلوم، ابو حامد غزالی، دار المعرفۃ، بیروت۔ (۳) اصول الدین، عبد القاہر بغدادی، استانبول ۱۹۲۸ء۔ (۴) الاعجاز والایجاز، ابو منصور ثعالبی، مکتبۃ القرآن، قاہرہ۔ (۵) الاغانی، ابو الفرج اصبہانی، دار الثقافۃ، بیروت ۱۹۵۵۔۱۹۶۵ء۔ (۶) الامالی، ابو علی قالی، دار الکتب المصریہ، قاہرہ ۱۹۲۶ء۔ (۷) الامالی، ابو القاسم زجاجی، تحقیق عبد السلام ہارون، دار الجیل، بیروت، ۱۹۸۷ء۔ (۸) الامثال الصادرۃ عن بیوت الشعر، حمزہ اصفہانی، تحقیق احمد بن محمد الضبیب، دار المدار الاسلامی، بیروت، ۲۰۰۹ء۔ (۹) الامثال فی الحدیث النبوی، ابو الشیخ اصبہانی، تحقیق عبد العلی عبد الحمید، الدار السّلفیہ، بمبئی ۱۹۸۲ء۔ (۱۰) انباہ الرواۃ علی انباہ النحاۃ، جمال الدین قفطی، دار الفکر العربی، قاہرہ ۱۹۸۶ء۔ (۱۱) انوار الربیع فی ازہار البدیع، ابن معصوم مدنی، تحقیق شاکر ہادی شکر، نجف ۱۹۶۹ء۔ (۱۲) البارع، ابو علی قالی، تحقیق ہاشم

الطعان، بغداد ۱۹۷۵ء۔(۱۳) بحر الدموع، ابن الجوزی، تحقیق جمال محمود مصطفیٰ، دارالفجر للتراث، ۲۰۰۴ء۔(۱۴) البصائر والذخائر، ابوحیان التوحیدی، تحقیق وداد القاضی، دار صادر، بیروت ۱۹۸۸ء۔(۱۵) البیان والتبیّن، جاحظ، تحقیق عبدالسلام ہارون، مکتبۃ الخانجی، قاہرہ، ۱۹۸۵ء۔(۱۶) تاج العروس، مرتضی زبیدی بلگرامی، وزارۃ الاعلام، کویت۔(۱۷) تاریخ اربل، ابن المستوفی، تحقیق سامی الصفار، وزارۃ الثقافۃ، بغداد ۱۹۸۰ء۔(۱۸) تاریخ مدینۃ السلام (بغداد)، تحقیق بشار عواد معروف، دارالغرب الاسلامی، بیروت ۲۰۰۱ء۔(۱۹) تتمۃ الیتیمۃ، ثعالبی، تحقیق عباس اقبال، تہران ۱۳۵۳ھ۔(۲۰) التذکرۃ الحمدونیۃ، ابن حمدون، تحقیق احسان عباس، دار صادر، بیروت ۱۴۱۷ھ۔(۲۱) التمثیل والمحاضرۃ، ثعالبی، تحقیق عبدالفتاح الحلو، الدار العربیۃ للکتاب، تونس ۱۹۸۳ء۔(۲۲) تہذیب اللغۃ، ابومنصور ازہری، جلد ۱۱، تحقیق محمد ابوالفضل ابراہیم، الدار المصریۃ للتالیف والترجمۃ، قاہرہ۔(۲۳) الحماسۃ البصریۃ، صدرالدین بصری، تحقیق عادل سلیمان جمال، مکتبۃ الخانجی، قاہرہ ۲۰۰۰ء۔(۲۴) حماسۃ البحتری، تحقیق محمد نبیل ظریفی، دار صادر، بیروت ۲۰۰۲ء۔(۲۵) حماسۃ الظرفاء، عبداللہ بن محمد زوزنی، تحقیق محمد بہی اللہ دارالکتاب المصری، قاہرہ ۱۹۹۹ء۔(۲۶) الحیوان، جاحظ، تحقیق عبدالسلام ہارون، دار إحیاء التراث العربی، بیروت۔(۲۷) الدر الفرید، محمد بن ایدمر، تحقیق کامل سلیمان جبوری، دارالکتب العلمیۃ، بیروت، ۲۰۱۵ء۔(۲۸) دیوان سنائی غزنوی، بسعی واہتمام مدرس رضوی، چاپ ہفتم، انتشارات سنائی، تہران، ۱۳۸۸ش۔۰۲۹) دیوان المتنبی، تحقیق عبدالوہاب عزام، لجنۃ التالیف والترجمۃ والنشر، قاہرہ ۱۹۴۴ء۔(۳۰) ربیع الابرار، زمخشری، مؤسسۃ الاعلمی، بیروت ۱۴۱۲ھ۔(۳۱) رسائل بدیع الزمان الہمدانی، جمع وتالیف عبدالرحمٰن بن محمد بن دوست النیسابوری، تحقیق احسان ذنون الثامری، دارالذخائر۔خزانۃ الادب، قاہرہ ۲۰۱۸ء۔(۳۲) روح البیان، اسماعیل حقی، دارالفکر، بیروت۔(۳۳) ریحانۃ الکتاب ونجعۃ المنتاب، لسان الدین ابن الخطیب، تحقیق محمد عبداللہ عنان، مکتبۃ الخانجی، قاہرہ ۱۹۸۰ء۔(۳۴) الزیادات علی الموضوعات، جلال الدین سیوطی، تحقیق رامز خالد حاج حسن، مکتبۃ المعارف، ریاض، ۲۰۱۰ء۔(۳۵) سحر البلاغۃ وسر البراعۃ، ثعالبی، دارالکتب العلمیہ، بیروت۔(۳۶) سیر اعلام النبلاء، شمس الدین ذہبی، جلد ۱۷، تحقیق شعیب الارناؤوط، موسسۃ الرسالۃ، بیروت ۱۹۸۳ء۔(۳۷) شرح دیوان صریع الغوانی (مسلم بن الولید)، تحقیق سامی الدہان، دارالمعارف، قاہرہ، ۱۹۸۵ء۔(۳۸) شعر الببغاء، تحقیق سعود محمود عبدالجابر، قطر، ۱۹۸۳ء۔(۳۹) شعر عبدالرحمٰن بن حسان الانصاری، جمع وتحقیق سامی مکی العانی، مطبعۃ المعارف، بغداد۔(۴۰) سلسلۃ الاحادیث الضعیفۃ والموضوعۃ، ناصر الدین البانی، دارالمعارف، ریاض، ۱۹۹۲ء۔۹۷۱ء۔

(۴۱) الشفا بتعریف حقوق المصطفی، قاضی عیاض، تحقیق علی محمد البجاوی، دارالکتب العربی، بیروت۔ (۴۲) طبقات الشافعیۃ الکبری، تاج الدین سبکی، تحقیق محمود طناحی، عبدالفتاح الحلو، ہجر للطباعۃ والنشر والتوزیع، قاہرہ ۱۴۱۳ھ۔ (۴۳) عبدالرحمٰن بن حسان بن ثابت۔ حیاتہ وشعرہ، جمع وتحقیق راشد بن مبارک الرشود، جامعۃ الملک سعود، ریاض ۱۴۳۹ھ۔ (۴۴) عیون الاخبار، ابن قتیبہ، دارالکتب المصریہ، قاہرہ۔ (۴۵) غرائب القرآن ورغائب الفرقان، نظام الدین نیشاپوری، دارالکتب العلمیۃ، بیروت ۱۴۱۶ھ۔ (۴۶) الفردوس بماثور الخطاب، شیرویہ دیلمی، دارالکتب العلمیہ، بیروت ۱۴۰۶ھ۔ (۴۷) قشر الفسر، ابوسہل زوزنی، تحقیق عبدالعزیز المانع، مرکز الملک فیصل، ریاض ۲۰۰۶۔ (۴۸) کارنامۂ نذیر، ڈاکٹر ریحانہ خاتون، انڈو پرشین سوسائٹی، دہلی ۱۹۹۵ء۔ (۴۹) کشف الاسرار معروف بتفسیر خواجہ عبداللہ انصاری، تالیف ابوالفضل رشیدالدین میبدی، تحقیق علی اصغر حکمت، تہران ۱۳۷۱ ش۔ (۵۰) الکفایۃ فی علم الراویۃ، خطیب بغدادی، المکتبۃ العلمیۃ، مدینہ منورہ۔ (۵۱) کہن نامۂ ادب پارسی، پژوہشگاہ علوم انسانی ومطالعات فرہنگی، تہران۔ (۵۲) لسان العرب، ابن منظور، دار صادر، بیروت۔ (۵۳) لوامع انوار القلوب، قاضی عزیزی بن عبدالملک المعروف بشیدلہ، مخطوط المکتبۃ المحمودیۃ مدینہ منورہ نمبر ۱۵۹۱۔ (۵۴) المجتنی، ابن درید، دائرۃ المعارف العثمانیۃ، حیدرآباد۔ (۵۵) المخلاۃ، بہاءالدین عاملی، تحقیق محمد خلیل الباشا، عالم الکتب، بیروت ۱۹۸۵ء۔ (۵۶) مرقاۃ المفاتیح، ملاعلی قاری، دارالفکر، بیروت ۲۰۰۲ء۔ (۵۷) المستدرک، حاکم نیشابوری، دارالکتب العلمیۃ، بیروت ۱۹۹۰ء۔ (۵۸) المستقصی، زمخشری، دائرۃ المعارف العثمانیۃ، حیدرآباد۔ (۵۹) مسند الشہاب القضاعی، تحقیق حمدی بن عبدالمجید سلفی، موسسۃ الرسالۃ، بیروت ۱۹۸۶ء۔ (۶۰) معاہد التنصیص علی شواہد التلخیص، عبدالرحیم عباسی، عالم الکتب، بیروت۔ (۶۱) معجم السفر، ابوطاہر السّلفی، تحقیق شیر محمد زمان، اسلام آباد ۱۹۸۸ء۔ (۶۲) المعجم الکبیر، طبرانی، تحقیق حمدی بن عبدالمجید سلفی، مکتبۃ ابن تیمیہ، قاہرہ۔ (۶۳) معرفۃ الصحابۃ، ابن مندہ، تحقیق عامر حسن صبری، جامعۃ الامارات العربیۃ المتحدۃ، العین ۲۰۰۵ء۔ (۶۴) الموفقیات = الاخبار الموفقیات، الزبیر بن بکار، تحقیق سامی مکی العانی، عالم الکتب، بیروت، ۱۹۹۶ء۔ (۶۵) یتیمۃ الدہر، ثعالبی، دارالکتب العلمیۃ، بیروت ۱۹۸۳ء۔ (۶۶) الیمینی، ابوالنصر عتبی، تحقیق احسان ذنون الثامری، دارالطلیعۃ، بیروت ۲۰۰۴ء۔

کرامت حسین کنتوری اور فقہ اللسان

ڈاکٹر قمر اقبال

انیسویں صدی کے اختتام اور بیسویں صدی کی ابتدا میں ہندوستان کے علمی افق پر، خاص طور سے مشرقیات کے ضمن میں، جن لوگوں نے اپنا مقام بنایا، ان میں ایک ممتاز نام کرامت حسین کا بھی ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان میں انگریزی علوم وفنون رواج پا رہے تھے۔ ہندوستان میں مغربی طرز کی متعدد جامعات قائم ہو چکی تھیں۔ آبادی کا خوش حال طبقہ انگریزی تعلیم کی طرف مائل تھا۔ ایسے ماحول میں جبکہ قدیم نظام حکومت بوسیدگی کا شکار ہو چکا تھا اور ایک نئی قوم ہندوستان کی تقدیر کی مالک بننے والی تھی، کرامت حسین اتر پردیش کے شہر جھانسی میں پیدا ہوئے، جہاں ان کے والد سراج حسین چرکھاری ریاست میں بغرض ملازمت مقیم تھے۔ صاحب نزہۃ الخواطر نے ان کا تفصیلی تعارف اپنی کتاب میں شامل کیا ہے۔ ان کے مطابق سال پیدائش ۱۲۶۹ھ ہے (۱) جو حساب لگانے پر ۱۸۵۲ء ہوتا ہے۔ کرامت حسین کا خانوادہ ضلع بارہ بنکی کی علمی بستی کنتور سے تعلق رکھتا تھا۔ صاحب عبقات الانوار مولانا حامد حسین کرامت حسین کے چچا تھے۔ دوسرے بہت سے فضلاء بھی اسی خانوادے میں پیدا ہوئے۔ اس طرح کرامت حسین شمالی ہندوستان کے علمی طور پر ممتاز شیعہ خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔

کرامت حسین کی ابتدائی تعلیم مروجہ طریقے پر ہوئی۔ اس کے بعد انھوں نے فقہ، تفسیر اور دیگر علوم عربیہ میں مہارت پیدا کی۔ تیرہ سال کی عمر میں اپنے چچا حامد حسین کے ساتھ حج کو گئے۔ حج سے واپسی کے بعد لکھنؤ کو اپنا مسکن بنایا۔ اس کے بعد تدریس سے وابستہ ہو گئے۔ اسی دوران انگریزی بھی سیکھتے رہے۔ متعدد جگہوں پر ملازمت کی۔ تدریس ہی نہیں انتظامی ذمہ داریاں بھی انجام دیں۔ اسی

شعبہ عربی، لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ۔

انتظامی ذمہ داری کے چلتے انہیں لندن جانے کا موقع ملا اور وہاں سے انہوں نے بیرسٹری کی سند تین سال میں حاصل کرلی۔ اس وقت لندن میں چار ادارے اس تعلیم کا انتظام کرتے تھے۔ کرامت حسین نے مڈل ٹمپل ان (Middle Temple in) میں داخلہ لیا۔ اس ادارے کے رجسٹر کے مطابق کرامت حسین ۱۱ر نومبر ۱۸۸۶ء کو اس ادارے سے وابستہ ہوئے اور ۳۰ر جولائی ۱۸۸۹ء کو فارغ ہوئے۔ (۲) رجسٹر میں داخلے کے وقت ان کی عمر چالیس سال درج ہے۔ اگر چالیس کے سن کو صحیح مان لیا جائے، تو صاحب نزہۃ الخواطر کے مطابق جو سن پیدائش ہے اس میں فرق آجائے گا۔ لندن کے سفر کا جو سال صاحب نزہۃ الخواطر نے لکھا ہے، اس کے حساب سے ان کی عمر اس وقت پینتیس سال تھی۔ اس اشکال کا کوئی حل سوائے اس کے نہیں ہوسکتا کہ لندن کے رجسٹر میں عمر اندازے سے لکھوائی گئی ہوگی۔

لندن سے واپس آکر الہ آباد میں وکالت سے وابستہ ہوگئے، پھر علی گڑھ میں کچھ دنوں کے لیے قانون کے استاد ہوگئے۔ علی گڑھ سے ان کے تعلق پر مولانا دریابادی نے شاید کا لفظ لگا کر شبہ کا اظہار کیا ہے (۳)، جبکہ دیگر تمام ذرائع بتاتے ہیں کہ کرامت حسین علی گڑھ میں تقریباً پانچ سالوں تک قانون کے استاد رہے۔ مزید صراحت کے ساتھ واضح کرنے کے لیے علی گڑھ کالج کے اس وقت کے گزٹ کو دیکھنا ہوگا۔

علی گڑھ سے واپسی کے بعد دوبارہ ہائی کورٹ الہ آباد کا رخ کیا۔ وہاں بطور جج ۱۹۰۸ء میں ان کا انتخاب ہوا۔ یہ خدمت وہ ۱۹۱۲ء تک انجام دیتے رہے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد دوبارہ لکھنؤ آگئے اور مطالعہ و تحقیق و تصنیف کے ساتھ ساتھ سماجی کاموں سے بھی اپنے آپ کو جوڑ لیا۔ سماجی کاموں کے ضمن میں یہ بتانا ضروری ہے کہ تعلیم نسواں سے ان کو خاص دلچسپی تھی۔ الہ آباد میں جب تھے تو لڑکیوں کے ایک اسکول کی ذمہ داری لی تھی۔ لکھنؤ آکر لڑکیوں کے لیے الگ سے ایک ادارہ قائم کیا، جو انہی کے نام سے منسوب ہوا اور شہر کا مشہور ڈگری کالج بنا۔

کرامت حسین علامہ شبلی کے مشہور ادارے دارالمصنّفین سے بھی وابستہ رہے۔ اس کی مجلس عاملہ کے نائب صدر تھے۔ لکھنؤ سے دارالمصنّفین میں نمایندگی کے لیے ان کو چنا گیا تھا۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے ان کی وفات پر جو مضمون لکھا ہے، اس میں اس کا تذکرہ ہے۔ (۴) غالباً دارالمصنّفین

کی وہ پہلی مجلس عاملہ تھی، جس کے وہ نائب صدر ہوئے۔ لیکن دارالمصنّفین کی صدسالہ تقریبات کے ضمن میں ہونے والے پروگراموں میں ان کا ذکر نہ آسکا۔

کرامت حسین کا قیام لکھنؤ میں آخر وقت تک رہا، جہاں ۱۹۱۷ء میں ان کا انتقال ہوا۔ اردو، عربی، فارسی اور انگریزی میں انہوں نے متعدد کتابیں لکھیں، جس کی تفصیل نزہۃ الخواطر میں موجود ہے۔ ایک کتاب المرأۃ کے نام سے لکھ رہے تھے، جو نا تمام رہی اور جس کے مسودے کی بابت مولانا دریابادی نے لکھا ہے کہ مدتوں ان کے پاس رہا پھر غائب ہوگیا۔ فلسفے پر بھی ان کا ایک رسالہ تھا اور بقول مولانا سید سلیمان ندوی:

''اردو میں جدید فلسفے کے مسائل پر لکھنے کی ابتدا انہی سے ہوئی''۔(۵)

عربی زبان میں ان کا سب سے نمایاں کام ان کی کتاب فقہ اللسان ہے جو تین جلدوں میں مطبع نول کشور سے ۱۹۱۵ء میں شائع ہوئی۔ کل صفحات کی تعداد ۱۲۰۰ ہے۔ صاحب کتاب کے مطابق ۱۸۸۶ء میں انہوں نے اس کام کی ابتداء کی اور ۱۹۱۵ء میں تکمیل کی۔(۶) گویا جس سال لندن گئے اسی سال سے اس کام کو انہوں نے شروع کیا۔

یہ کتاب دراصل عربی زبان کے ایسے مصادر پر مشتمل ہے جو ان کے مطابق مختلف آوازوں کے مشابہ ہیں۔ انہیں آوازوں کی نقل سے ان مصادر کی تکوین ہوئی۔ زبان پر غور کا یہ انداز کوئی نیا نہ تھا لیکن جس حد تک جا کر اس اصول کی عملی تطبیق میں مصادر کو یکجا کیا گیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ یہاں یہ اضافہ بالکل بے جا نہ ہوگا کہ زبان اور الفاظ کے وجود میں آنے کا مسئلہ اشاعرہ اور معتزلہ کے یہاں بھی زیر بحث رہا ہے۔ اشاعرہ زبان کی آفرینش کو الہامی تصور کرتے تھے۔ ہندوؤں اور عیسائیوں کے یہاں بھی ایسے ہی نظریات موجود ہیں۔(۷) لیکن معتزلہ کے مطابق الفاظ اور زبان کی تخلیق میں گردوپیش کے احوال نے اپنا رول ادا کیا ہے۔ ابوہاشم معتزلی کا اس ضمن میں نام لیا جاتا ہے کہ اسی نے اس نظریہ کی ابتدا کی۔ شاہ ولی اللہ بھی زبان کے ارتقاء کے ضمن میں اسی زاویے سے بحث کرتے ہیں۔ انہوں نے طعن بالرمح کی مثال پیش کرکے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ طعن کا لفظ نیزہ چلانے سے جو آواز پیدا ہوتی ہے اس کی نقل کرتے ہوئے وجود میں آیا ہے۔(۸) جرجی زیدان کی کتاب فلسفۃ اللغۃ العربیۃ میں صوتی محاکات پر تفصیلی گفتگو ہے۔ اس نظریے کو بہت سے ماہرین لسانیات نے رد بھی کیا ہے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

کے سابق استاد سید سلیمان اشرف نے اپنی کتاب المبین میں زیدان کے حوالے سے اس نظریے پر سخت گرفت کی ہے۔(۹) ایک عرب مصنف اس نظریے پر کلام کرتے ہوئے لکھتا ہے:

''اگر یہ نظریہ صحیح ہوتا تو زبانوں کی تعداد نہ بڑھتی یا زبانیں کم از کم باہم مشابہ ہوتیں کیونکہ فطری آواز تو ایک ہی ہوگی لیکن زبانوں کا ایک جیسے الفاظ بنانا اور ایسے مشابہ الفاظ کا وجود میں آنا جو ایک ہی معنی پر دلالت کریں کم ہی واقع ہوتا ہے''۔(۱۰)

زبان کے وجود میں آنے کا نظریہ یوروپ میں بھی بڑا مختلف فیہ رہا ہے۔فرانس میں تو اس موضوع کو عبث خیال کرتے ہوئے اس پر گفتگو کو ہی ممنوع قرار دے دیا گیا تھا۔موجودہ وقت میں زبان کے وجود پر کم از کم پانچ نظریات موجود ہیں(۱۱)،جس کی تفصیل سے اجتناب کرتے ہوئے نظریہ محاکات کے ضمن میں صرف یہ کہنا کافی ہوگا کہ اس کی جڑ میں ارسطو کا فلسفہ ہے۔ڈارون کے نظریہ ارتقاء نے زبان کے حوالے سے لوگوں کو غور کرنے پر مجبور کیا ہے اور پھر ہربرٹ اسپنسر کے سماجی فلسفے نے اس کو اور وسعت دی۔اسی اسپنسر سے کرامت حسین کافی متاثر تھے۔لوگ از راہ مذاق ان کو بقول مولانا دریابادی حافظ اسپنسر کہنے لگے تھے۔(۱۲) ایسے ہی فلسفیانہ خیالات سے متاثر ہوکر کرامت حسین نے اپنی مذکورہ کتاب ترتیب دی۔پہلی جلد مکمل طور پر انہیں نظریات کی توضیح وتشریح ہے۔دوسری اور تیسری جلد میں مصادر کو یکجا کرکے اس نظریہ کو عملی طور پر ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

صاحب کتاب ایک مصدر کا انتخاب کرتے ہیں جو عام طور پر ثلاثی ہوتا ہے ہاں کچھ رباعی مصادر بھی آگئے ہیں پھر یہ ثابت کیا ہے کہ اصلی یہ مصدر ہے جو کسی آواز کی نقل میں وجود میں آیا،پھر اسی کے زیر اثر مختلف ایسے مصادر وجود میں آئے،جن میں کسی حد تک معنوی اشتراک ہے۔دوسری جلد میں تقریباً ڈیڑھ سو مصادر کو جمع کیا گیا ہے۔(۱۳) مصنف کے مطابق لفظ ھدم اصلی مصدر ہے۔کسی دیوار کے گرنے سے جو آواز پیدا ہوتی ہے،اس کی نقل میں یہ مصدر وجود میں آیا۔اسی ھدم کا فروعی مصدر عدم (۱۴) ہے،جس میں مصنف کے مطابق ھا کی جگہ عین آگیا ہے۔معنوی اشتراک کی جانب اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ منہدم دیوار چونکہ ختم ہوجاتی ہے اسی لیے عدم کو کسی چیز کے فنا اور فقدان کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔(۱۵) ھدم کے ضمن میں مصنف نے نو مصادر کا تذکرہ کیا ہے جو سب کے سب فروعی ہیں۔آج یہ مصادر مختلف معانی میں استعمال ہوتے

ہیں لیکن مصنف کے مطابق ان میں معنوی اشتراک ہے۔ یہ نو مصادر عدم، ھذم، ھتم، ھثم، حطم، ھجم، جحم، جحب اور ھجدم ہیں۔ ان نو مذکورہ مصادر پر غور کیا جائے تو جس نکتے کی طرف صاحب کتاب نے اشارہ کیا ہے، اسے آسانی سے رد نہیں کیا جا سکتا ہے۔ یقیناً ان تمام مصادر میں صوتی ہم آہنگی کے علاوہ بھی ایک اور نقطہ اشتراک موجود ہے۔ ایک اور مثال قطط کی لے لی جائے۔ یہ لفظ علمائے لغت کے یہاں اختلافی رہا ہے۔ جرجی زیدان نے اس کو دو حرفی بتایا ہے، جس پر صاحب المبین نے تنقید بھی کی ہے۔(۱۶) لیکن کرامت حسین اس کو سہ حرفی مانتے ہیں، اسی لیے قطط کی املاق ط ط موجود ہے۔ یہ الگ بات کہ محاکات الصوت کے ضمن میں اسی پیرائے پر چلتے ہوئے لفظ قطع کو قطط کا فروعی مصدر مانا ہے۔

اس کتاب کی ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ معانی کی تشریح و توضیح میں فاضل مصنف نے عربوں کے اقوال و امثال، قرآن شریف کی آیات کریمہ اور احادیث مبارکہ سے بھی جا بجا استدلال کیا ہے۔ الفاظ کی معنوی تحدید کے ضمن میں ایسی کوشش بلا شبہ فاضل مصنف کی وسعت نگاہ کی دلیل ہے۔ ہندوستان میں کرامت حسین کے ہم عصر دوسرے علماء کے یہاں بھی یہ طریقہ کار نظر آتا ہے۔ خصوصاً مولانا فراہی کے یہاں لیکن مولانا خاص قرآنی الفاظ ہی کو اپنی تحقیق کا موضوع بناتے ہیں، جب کہ کرامت حسین کے یہاں عربی کے عام مصادر کے ضمن میں ایسا کیا گیا ہے۔

ایک اور امتیاز فقہ اللسان کا یہ ہے کہ ہر مصدر کے ضمن میں عبرانی و سریانی زبانوں کے ہم شکل اور ہم معانی الفاظ کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے۔ اگر کسی زبان میں کوئی ایسا لفظ مصنف کے سامنے نہیں آتا تو صاحب کتاب لکھ دیتے ہیں کہ فلاں زبان میں یہ لفظ ان کو نہیں ملا۔ یہ طریقہ کار الفاظ پر تحقیق کرنے والوں کے لیے بڑے کام کی چیز ہے۔ مشتقات کے ضمن میں تو ایسی کوششیں پہلے بھی ہوئی تھیں، لیکن مصادر اور پھر مصادر سے پیدا شدہ الفاظ کے حوالے سے اتنا وسیع کام بڑی جگر سوزی کا تھا۔ سریانی اور عبرانی کا تذکرہ جہاں موازنہ کی راہ استوار کرتا ہے وہیں اس امر کی بھی شہادت ہے کہ زبانوں کے خاندان کے سلسلے میں کرامت حسین یورپی نظریے کو مانتے تھے۔ اٹھارہویں صدی کے اواخر میں یہ نظریہ پہلی بار سامنے آیا تھا۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ جسٹس کرامت حسین نے فقہ اللسان جیسا شاندار کارنامہ انجام دے کر عربی لسانیات کے ضمن میں اپنی مستقل جگہ بنا لی ہے بھلے ہی کوئی ان کے نظریات اور طریقہ استدلال

سے اختلاف رکھے لیکن ان کی علمیت کے اعتراف سے اپنے آپ کو نہیں روک سکتا۔ لسانیات جیسے خشک موضوع پر اتنا وسیع کام، مصادر کو جمع کرکے ان میں معنوی اور صوتی اشتراک کی تلاش پھر مشتقات کی معنوی تفہیم کے لیے عربوں کے اقوال سے استدلال اور پھر عربی خانوادے کی دیگر زبانوں سے ہم معانی اور ہم صوت الفاظ کا انتخاب مصنف کے کمال کی دلیل ہے۔ عربی لسانیات میں یہ کتاب اہم مرتبے کی مستحق ہے۔ ضرورت ہے کہ اس کا تفصیلی مطالعہ کیا جائے تاکہ ہندوستان کی عربی ادبیات میں صاحب کتاب کا صحیح مرتبہ متعین ہوسکے۔

حوالہ جات

(۱) عبدالحئی الحسنی، نزہۃ الخواطر، ج ۷، ۱۴۲۱ھ، ص ۱۳۳۱۔

(۲) Visit the site: https: //hosted. law.wisc. edu/wordpress/ sharafi/ south-asian-law-students-at-the-inns-of-court/ or search & see pdf file named: South Asians at the Inns of Court: Middle Temple, 1863-1994.

(۳) عبدالماجد دریابادی، معاصرین، ص ۹۸۔ (۴) سید سلیمان ندوی، یاد رفتگاں، دارالمصنفین، اعظم گڑھ، ۲۰۰۰ء، ص ۳۶۔ (۵) ایضاً۔ (۶) کرامت حسین، فقہ اللسان، ج دوم، مطبع نول کشور لکھنؤ، ۱۹۱۵ء، ص ۳۲۱۔

(۷) George Yule, The Study of language,3rd. ed. Cambridge, 2009, pp 1-2.

(۸) شاہ ولی اللہ، حجۃ اللہ البالغۃ، دارالجیل، بیروت، ۲۰۰۵ء، باب الارتفاق الاول۔ (۹) سلیمان اشرف، المبین، المجمع الاسلامی، مبارک پور، اعظم گڑھ، طبع چہارم، ۲۰۰۳ء، ص ۱۱۰۔ (۱۰) محمد المبارک، فقہ اللغۃ وخصائص العربیۃ، دارالفکر الحدیث، لبنان، طبع دوم، ۱۹۶۴ء، ص ۱۸۷-۱۸۸۔

(۱۱) George Yule, The Study of language,pp 1 -5.

(۱۲) عبدالماجد دریابادی، معاصرین، ص ۹۸۔ (۱۳) کرامت حسین، فقہ اللسان، ج دوم، ص ۱۵۵۔ (۱۴) ایضاً، ص ۱۵۸۔ (۱۵) ایضاً، ص ۱۲۰۔ (۱۶) تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو سلیمان اشرف کی المبین، ص ۱۰۴-۱۱۰۔ (۱۷) کرامت حسین، فقہ اللسان، ج دوم، ص ۱۷۱۔

شری مدبھگوت گیتا اور مسلم مصنّفین

ڈاکٹر ٹی۔آر۔رینا

(۲)

عرض مترجم میں حقی صاحب لکھتے ہیں:

''لکھنؤ دوردرشن میں مجھ سے ایک نوجوان نے سوال کیا کہ آپ نے گیتا کا ترجمہ کیوں کیا ہے؟ اس پر مجھے بھی اپنے آپ سے یہی سوال کرنا پڑا۔دراصل یہ کوئی شعوری فیصلہ نہیں تھا۔بس ایک اضطراری اقدام تھا،ایک اندرونی تحریک۔گیتا سے دلچسپی تو لازمی تھی کہ یہ دنیا کا ایک اہم صحیفہ ہے،جو نسل درنسل دلوں کو گرماتا رہا ہے اور کروڑوں انسانوں کے لیے روحانی تسکین کا ذریعہ بھی ہے۔اب سے بہت پہلے میں نے بھگود گیتا کے بعض اردو ترجے دیکھے تھے،لیکن وہ میرے دل کو نہیں لگے تھے۔ان سے مجھے مطالعے کی ترغیب نہیں ہوئی اور لطف مطالعہ نہیں ملا۔شاید یہ میری ہی کوئی کوتاہی یا کج فہمی یا وقتی بے دلی ہو۔بہرحال ایک ذاتی تاثر ہے۔وہ بھی کبھی پہلے کا مجھے دوسرے کارناموں سے کوئی تعرض مقصود نہیں۔میرا خیال ہے کہ ادبی ترجمے کے لیے بھی ویسی وجدانی تحریک ضروری ہے جو تخلیق کے لیے ہوتی ہے، یہ محض کوئی میکانکی عمل نہیں ہوتا۔جس طرح تخلیق میں فکری آزادی کے ساتھ ساتھ کچھ حدود بھی عائد ہوتی ہیں۔مثلاً قواعد ومحاورے کی بنیادی (یا آرٹ میں مخصوص میڈیم کی حدود) اور پھر وزن وقافیہ کی پیروی۔اسی طرح ترجمے میں یہ قید بھی موجود

الیف ۷ ۲۳،لوئر ہری سنگھ نگر رہاڑی کالونی،جموں ۱۸۰۰۰۵۔ (Mob: 9419828542)

رہتی ہے کہ اصل سے انحراف نہ ہو اور یہ بہت کڑی شرط ہے۔ایسی بندشیں کسی وہبی عمل ہی سے نبھ سکتی ہیں‘‘۔(ص ۳۱)

اس اقتباس میں ان الفاظ پر غور فرمائیں:

’’یہ کوئی شعوری فیصلہ نہیں تھا۔بس ایک اضطراری اقدام تھا،ایک اندرونی تحریک۔بہرحال ایک ذاتی تاثر ہے،وہ بھی کبھی پہلے کا۔ایسی بندشیں کسی وہبی عمل ہی سے نبھ سکتی ہیں‘‘۔

ان جملوں سے ثابت ہوتا ہے کہ حقی صاحب نے گیتاجی کے ترجمے کے لیے کوئی منصوبہ نہیں بنایا تھا،بلکہ وہبی عمل کے تاثر سے ان کے اندر ایک اضطراری تحریک پیدا ہوئی جس سے یہ خوب صورت منظوم ترجمہ صفحۂ قرطاس پر ابھر آیا۔

ترجمے کا مقصد بیان کرتے ہوئے یوں رقم طراز ہیں:

’’میں نے یہ ترجمہ بڑے شوق اور چاؤ سے کیا ہے اور اس کے لیے اردو زبان کی صلاحیتوں کو حسب مقدور بروئے کار لانے کی کوشش کی ہے۔یہ میرے لیے مشقت نہیں،مسرت تھی۔دل کشائی اور آگاہی کا ذریعہ نہ کہ صرف طبع آزمائی۔ اس کا مطالعہ قدم قدم پر قرونِ مابعد کے مسلم صوفیہ کے اقوال وعقائد کی طرف دھیان لے جاتا ہے۔یہ وہ صحیفہ ہے جو انسان کو پرماتما یا روحِ اعلیٰ کا ایک جزو،ہم نفس یا نفسِ ناطق قرار دے کر انسان کا مان بڑھاتا ہے اور خوش اعمالی کے ذریعہ کرم چکر سے نکل کر ابدی مسرت پانے کی ترغیب دیتا ہے۔یہ ایک ایسا برگزیدہ اور بے نفس انسان کا تصور پیش کرتا ہے جو دوسروں کے لیے بے آزار لیکن اپنی جان کے لیے سراپا آزار ہوگا،لیکن حس آزار سے بے گانہ رنج وراحت کے احساس سے مبرا۔یہ مرتبہ پانا ہر شخص سے متوقع نہیں۔عام سطح پر لوگ اپنے اپنے کار منصبی اور دھرم کرم کو لگن سے انجام دے کر بھی نجات کے مستحق ہو سکتے ہیں‘‘۔(ص ۳۲و۳۳)

گیتاجی کا ترجمہ کرتے وقت جو کیفیت ان پر طاری ہوتی رہی انھی کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیں:

’’مذہبی معاملات میں اصل گواہی اندر کی گواہی ہوتی ہے نہ کہ خارجی

استدلال۔ آپ کچھ بھی کہا کریں۔ ماننے والے وہی مانیں گے جو ان کا دل مانے گا۔
اس کی قدر و قیمت کے بابت میں اتنا ہی کہوں گا کہ اس کے محاسن کا ادراک کرنے اور
ان پر وجد کرنے کے لیے شرط اول خشوع و خضوع ہے۔ یہ بات دوسرے صحائف
بلکہ تخلیقی شہ پاروں کی بابت بھی کہی جاسکتی ہے کہ کثرت مطالعہ سے ان کا نقش اور گہرا
ہوجاتا ہے، بلکہ عہد بہ عہد نئے محاسن اور نئے معانی بھی نظر آتے ہیں۔ جہاں تک گیتا
کا تعلق ہے اس کی عظمت پر صدیوں کی مہریں ہیں۔ دل نشینی پر ان گنت گواہیاں،
اس کو تنقیدی مطالعے کی میز پر لٹانا، اس کے تقدس سے کھیلنا اور سورج کو چراغ دکھانا
ہے''۔ (ص ۳۳)

ڈاکٹر شان الحق حقی کی علمیت سے کسی کو انکار نہیں، یہی وجہ ہے کہ جب انہوں نے گیتا کا ترجمہ کیا تو ان کے پیش نظر سنسکرت کے اصل متن کے علاوہ انگریزی کے بہت سے ترجمے تھے۔ وہ دلی والے تھے اور زبان پر انہیں غیر معمولی قدرت حاصل تھی، وہ اور کئی زبانیں بھی جانتے تھے۔ وہ عرصے سے پھیپھڑے کے کینسر میں مبتلا رہے۔ ۱۱/اکتوبر ۲۰۰۵ء کو مسی سادگا، کنیڈا میں ۸۸ برس کی عمر میں ان کا انتقال ہوا۔

اب ہم ان چاروں ترجموں کا گیتا جی کے ادھیاؤں کی روشنی میں ذکر کریں گے تاکہ اسرار خداوندی کا انکشاف قاری پر بآسانی ہوسکے اور ''میں'' و ''تو'' کا فرق مٹ جائے۔

جنگ شروع ہونے سے قبل کوروؤں اور پانڈوؤں کی فوجیں کوروکھیشتر کے میدان میں ایک دوسرے کے مقابل آکر کھڑی ہوجاتی ہیں۔ دھرت راشٹر جو کوروؤں کے والد اور پانڈوؤں کے چاچا ہیں، نابینا ہونے کی وجہ سے میدان جنگ میں جانے کے قابل نہیں تھے، اپنے وزیر سنجے سے پوچھتے ہیں کہ میدان جنگ میں اس وقت کیا ہو رہا ہے؟ ہستناپور کے راج سنگھاسن (پایۂ تخت) پر اس وقت دھرت راشٹر براجمان تھے (یعنی حکمران تھے)۔ گیتا کی شروعات دھرت راشٹر اور سنجے کے مکالمے سے ہوتی ہے۔ دھرت راشٹر پوچھتا ہے: (اشلوک سنسکرت میں)

دل محمد نے سنسکرت کے اس اشلوک کو یوں نظم کیا ہے:

کُروکھیت کی دھرم بھومی پہ جب

ملے پانڈووں سے مرے لال سب
لڑائی کا دل میں جمائے خیال
تو سن جے بتا ان کا سب حال چال

سن جے نے کہا:

مہاراج! آئی نظر جس گھڑی
صف آرا سپہ پانڈووں کی کھڑی
گئے راجہ دریودھن اٹھ کر شتاب
کیا جا کے اپنے گُرو سے خطاب

محمد اجمل خاں نے ان سنسکرت اشلوکوں کا نثری ترجمہ یوں کیا ہے:

۱۔اے سنجے مجھے بتاؤ کہ اس پاک سرزمین میں جسے کوروکھشیتر (کوروکا میدان) کہتے ہیں۔ جنگ کرنے کی خواہش سے جمع ہو کر میرے اور پانڈوں کے بیٹوں نے کیا کیا؟

سنجے نے جواب دیا:

۲۔اے دھرت راشٹر جب راجہ دریودھن نے (اپنے مقابل) پانڈوں کی فوج کو صف آرا پایا تو وہ اپنے گرو (درونا آچاریہ) کے پاس جا کر یوں گویا ہوئے۔

نواب جعفر علی اثر لکھنوی کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیں:

ارجن وشاد

یہ سنجے سے پوچھا دھرت راشٹر نے
کہ جب کورو پانڈے صف آرا ہوئے
کوروکشیتر کی وہ مقدس زمیں
زمیں کیسی رشک بہشت بریں
بیاں کر وہاں کا ذرا ماجرا
کہ آغاز کیوں کر ہوا جنگ کا
کیا حال سنجے نے یوں آشکار

کہ گویا ہے پیش نظر کارزار
یہ کی عرض، اے شاہ گردوں سپاس
دریودھن گئے خود درونا کے پاس

ڈاکٹر شان الحق حقی کا ترجمہ دیکھیے:

۱۔ یہ پوچھا راے دسرت نے
کروکشیتر کی پاکیزہ زمیں پر جب مرے لڑکے
گئے ہیں لیس ہو کر سامنے پانڈوں کے پوتوں کے
تو کیا گزری کہو سنجے

۲۔ کہا سنجے نے اے راجن!
نظارہ پانڈو کے دل کا کرکے راے دریودھن
گئے اپنے گرو کے پاس جو سالار ہیں ان کے
اوران سے مل کے یوں بولے:

میدان جنگ میں سب سے پہلے بھیشم پتامہ نے اپنا شنکھ پھونکا، اس کی آواز سن کر سبھی سپہ سالاروں نے اپنے اپنے شنکھ پھونکنے شروع کیے، جن کی آوازوں سے پورا میدان کارزار گونج اٹھا۔ شری کرشن جی مہاراج اور ارجن جب اپنا اپنا شنکھ پھونک چکے تو ارجن نے شری کرشن جی مہاراج سے کہا کہ میرا رتھ دونوں افواج کے درمیان لے چلو تا کہ میں یہ دیکھ سکوں کہ میرے مدمقابل کون ہے اور مجھے کن سے جنگ کرنی ہے۔

شری کرشن جی مہاراج ارجن کے رتھ کو کوروؤں کی فوج کے سامنے لا کھڑا کرتے ہیں۔ ارجن اپنے دادا بھیشم پتامہ، گرو درونا آچاریہ، اپنے چاچا زاد سو بھائیوں کورو پتروں اور بہت سے قریبی رشتہ داروں کو دیکھ کر اپنے حواس کھو دیتا ہے اور دھنش بان رکھ کر رتھ میں بیٹھ جاتا ہے اور جنگ کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔ شری کرشن جی مہاراج سے کہتا ہے:

"اپنے بھائی بندوؤں کو مار کر جو راج پاٹ حاصل ہوگا، اس سے تو بھیک مانگ کر گزارا کرنا بہتر ہے"۔

شری کرشن جی مہاراج ارجن سے یوں مخاطب ہوتے ہیں:

"اس فانی دنیا میں نہ کوئی کسی کو مارتا ہے اور نہ کوئی مرنے والا ہے۔ خالق کائنات یعنی ایشور نے جو کچھ طے کر رکھا ہے، وہی ہوگا۔ انسان ایشور کی طاقت کے سامنے مجبور ہے۔ ہوتا وہی ہے جو وہ چاہتا ہے۔ تو خود قدرت کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہی کرے گا، جو ہونے والا ہے۔ روح ہمیشہ سے قائم و دائم ہے۔ یہ نہ خود مرتی ہے اور نہ کسی کو مارتی ہے۔ اسے نہ تو کاٹا جاسکتا ہے، نہ ڈبویا جاسکتا ہے، نہ جلایا جاسکتا ہے اور نہ سکھایا جاسکتا ہے۔ انہی سب باتوں کو شعرا و ادبا نے یوں قلم بند کیا ہے، جنہیں بھگوان شری کرشن جی مہاراج نے دوسرے ادھیائے کے سانکھ یوگ کے اشلوک نمبر ۱۱ تا ۲۷ میں بیان کیا ہے"۔ (سنسکرت میں اشلوک)

دل محمد صاحب گیتا جی کے ان اشلوکوں کا مفہوم یوں نظم کرتے ہیں:

۱۱۔ تو باتوں کے عاقل! نہ ہو دل ملول
نہ کر ان کا غم جن کا غم ہے فضول
ستائیں نہ دانا کو رنج و الم
مرے کا نہ سوگ اور نہ جیتے کا غم

۱۲۔ ازل سے تھی موجود ہستی مری
ازل سے تھی موجود ہستی تری
یہ راجے سبھی اور یہ خلقت تمام
ہمیشہ سے ہیں اور رہیں گے مدام

۱۳۔ کرے روح جیسے تغیر بغیر
لڑکپن جوانی بڑھاپے کی سیر
یہیں پھر نئے تن میں ہوگی مکیں
اگر دل ہے مضبوط چنتا نہیں

۱۴۔ یہ گرمی، یہ سردی، یہ دکھ سکھ تمام

بس احساس اشیا سے ہوں لا کلام
یہ کیفیتیں آنی جانی ہیں یہ
سہے جا خوشی سے کہ فانی ہیں یہ

۱۵۔ وہ انساں اثر جس پہ ان کا نہیں
خوشی سے جو خوش ہو نہ غم سے حزیں
سن ارجن ہے قائم دل اس کا مدام
اسی کی ہے شایاں حیات دوام

۱۶۔ جو باطل ہے موجود ہوتا نہیں
جو حق ہے وہ نابود ہوتا نہیں
وہ ہیں بود و نابود سے باخبر
حقیقت پہ رہتی ہے جن کی نظر

۱۷۔ اسی کو بقا ہے اسی کو ثبات
جہاں پر ہے چھائی ہوئی جس کی ذات
بھلا کس کی طاقت ہے کس کی مجال
فنا کرسکے ہستی لا زوال

۱۸۔ بسائے ہیں جس آتما نے وجود
وہ قائم ہے دائم ہے اور بے حدود
ہے فانی بدن آتما لا زوال
پھر ارجن ہے کیوں جنگ میں قیل و قال

۱۹۔ کبھی خون کرتی نہیں آتما
کبھی خود بھی مرتی نہیں آتما
نہ قاتل ہے یہ اور نہ مقتول ہے
جو ایسا سمجھتا ہے مجہول ہے

۲۰۔ جنم اس کو لینا نہ مرنا اسے
نہ آکر جہاں سے گذرنا اسے
انادی، فنا اور تغیر سے پاک
یہ مرتی نہیں گو بدن ہو ہلاک

۲۱۔ جو سمجھے اسے دائم و لا یزال
مبرّا ولادت سے اور بے زوال
کسی کا وہ کیوں کر بہائے گا خون
کسی کا وہ کیوں کر کرائے گا خون

۲۲۔ بدلتا ہے انساں لباس کہن
نیا جامہ کرتا ہے پھر زیب تن
اسی طرح قالب بدلتی ہے روح
نئے بھیس میں پھر نکلتی ہے روح

۲۳۔ کٹے گی نہ تلوار سے آتما
جلے گی کہاں نار سے آتما
نہ گیلی ہو پانی لگانے سے یہ
نہ سوکھے ہوا میں سکھانے سے یہ

۲۴۔نہ کٹ ہی سکے اور نہ جل ہی سکے
نہ سوکھے نہ پانی سے گل ہی سکے
قدیم اور اٹل بھی ہے دائم بھی ہے
محیط جہاں بھی ہے قائم بھی ہے

۲۵۔ نہیں آتما کو تغیر زوال
حواس اس کو پائیں نہ پہنچے خیال
تجھے آتما کا جو یہ گیان ہے

تو پھر کس لیے غم سے ہلکان ہے

۲۶۔ اگر تو سمجھتا ہے یہ آتما
ہو پیدا کبھی اور کبھی ہو فنا
تو پھر بھی ہے لازم تجھے اور قوی
کہ غم آتما کا نہ کرنا کبھی

۲۷۔ جو پیدا ہو موت اس کو آئے ضرور
مرے تو جنم پھر وہ پائے ضرور
جو یہ امر لازم ہے اور ناگزیر
تو پھر کس لیے تو ہے غم کا اسیر

اب محمد اجمل خاں کا نثری ترجمہ ملاحظہ فرمائیں:

۱۱۔تو ان چیزوں کے لیے غم زدہ ہے جن کے لیے غم کرنا مناسب نہیں اور عالموں کی سی باتیں کرتا ہے لیکن عقل مند (یا صاحب عرفان) نہ تو زندوں کے لیے غم کرتے ہیں نہ مردوں کے لیے۔

۱۲۔ میں کبھی عدم موجود نہ تھا نہ تو، نہ یہ راجا غیر موجود تھے اور نہ ہم میں کوئی اس کے بعد فنا ہوگا۔ہم سب غیر فانی ہیں۔

گاہے بفلک مہر درخشاں بودم
گاہی بہوا ذرہ پویاں بودم
گاہے دل وگاہے تن وگہ جاں بودم
زیں پس ہمہ آں شوم کہ ہم آں بودم

۱۳۔جس طرح (موجودہ) جسم میں بچپن، جوانی اور بڑھاپا آتا ہے یا روح پر اثر کرتا ہے۔اسی طرح وہ دوسرے جسم میں منتقل ہوتا ہے۔عقل مند انسان اس پر رنج نہیں کرتا۔

۱۴۔اے کنتی کے بیٹے! مادہ لمس جس سے گرمی سردی، لذت والم پیدا ہوتے ہیں یہ آنے جانے والی غیر مستقل چیزیں ہیں۔اے بھارت انہیں استقلال سے برداشت کرو۔

۱۵۔جس شخص کو یہ باتیں تکلیف نہیں دیتیں، جو دکھ سکھ میں اپنا توازن قائم رکھتا ہے اور مستقل مزاج رہتا ہے۔وہی غیر فانی ہونے کا مستحق ہے۔

۱۶۔جو شخص غیر حقیقی ہے۔(لاوجود) اس کا وجود ہی نہیں اور جو حقیقی ہے (باوجود) وہ کبھی فنا نہیں ہوتی۔

جو لوگ عارف ہیں وہی دونوں کے انداز سے واقف ہیں۔

آئینۂ عدم ہی میں ہستی ہے جلوہ گر
ہے موج زن تمام یہ دریا حباب
ہر جز کو کل کے ساتھ بمعنی ہے اتصال
دریا سے در جدا ہے پہ ہے غرق آب میں (خواجہ میر دردؔ)

۱۷۔ جس نے ان سب چیزوں کو پھیلایا ہے اس ذات (آتما، روح) کو لا فانی سمجھ، کوئی بھی اس ذات لامتناہی کو فنا نہیں کرسکتا۔

۱۸۔ یہ جسم جو روحوں کے گھر ہیں، فانی ہیں۔ روح غیر فانی اور لامتناہی ہے۔ اس لیے اے ارجن لڑو۔

۱۹۔ جو اس روح کو فنا کرنے والی سمجھتے ہیں اور وہ جو اس کو فنا ہونے والی سمجھتے ہیں۔ دونوں جاہل ہیں۔ اس لیے کہ نہ تو روح قتل کرتی ہے اور نہ قتل ہوسکتی ہے۔

۲۰۔ وہ نہ کبھی پیدا ہوتی ہے نہ کبھی مرتی ہے۔ نہ وہ عالم وجود میں آ کر فنا ہوگی۔ وہ غیر پیدا شدہ ہے، دائمی ہے۔ قدیم ہے اور ازلی ہے۔ جسم کے قتل ہونے سے وہ قتل نہیں ہوتی۔

۲۱۔ اے پارتھ! بھلا وہ شخص جو روح کو لافانی، دائمی، غیر پیدا شدہ اور نہ مرنے والی سمجھتا ہو، وہ شخص کسے قتل کرسکتا ہے یا قتل کراسکتا ہے۔

۲۲۔ جس طرح کوئی پرانا لباس اتار کر نیا لباس پہنتا ہے۔ اسی طرح جسم میں رہنے والی (یعنی روح) پرانے جسموں کو چھوڑ نئے جسموں میں داخل ہو جاتی ہے۔

۲۳۔ نہ ہتھیار اسے زخمی کر سکتے ہیں، نہ آگ اسے جلاسکتی ہے، نہ پانی اسے تر کرسکتا ہے، نہ ہوائیں اسے خشک کرسکتی ہیں۔

۲۴۔ وہ ناقابل قطع، نہ جلنے والی، نہ خشک و تر ہونے والی شئے ہے، وہ دائمی ہے، ہر جگہ موجود ہے، مستقل ہے، غیر متحرک اور قدیم ہے۔

۲۵۔ نہ حواس اسے محبوس کر سکتے ہیں، نہ خیال اس کا تصور کرسکتا ہے۔ وہ غیر مبدل ہے، لہٰذا اسے ایسا سمجھ کر تجھے اس کے واسطے غم نہیں کرنا چاہیے۔

۲۶۔ اور اگر تو سمجھتا ہے کہ وہ ہمیشہ (جسم کے ساتھ) پیدا ہوتی اور مرتی ہے، تب بھی تیرے لیے زیبا

نہیں ہے کہ تو اس کے لیے رنج کرے۔

۲۷۔ اس لیے کہ جو پیدا ہوا ہے وہ یقیناً مرے گا اور جو مرے گا وہ یقیناً پیدا ہوگا، لہٰذا تیرے لیے ایسی چیز پر رنج کرنا فضول ہے جو کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔

نواب مرزا جعفر علی خان اثر لکھنوی نے گیتا جی کے ہر ادھیائے کا ترجمہ اشلوک بہ اشلوک نہیں کیا ہے، بلکہ اس کے مفہوم کو اشعار کے قالب میں ڈھالا ہے جس سے اشلوک کی ترتیب بدل گئی ہے اور عام قاری کو اشلوک بہ اشلوک مفہوم سمجھنے میں کچھ مشکل ضرور پیش آتی ہے کہ کس اشلوک کا ترجمہ کہاں سے شروع ہوتا ہے اور کہاں پر ختم ہوتا ہے۔ انہیں خود بھی اس بات کا اعتراف ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''اہل نظر کو اندازہ ہوگا کہ میرا ترجمہ لفظی ترجمہ نہیں ہے بلکہ ہر ادھیائے کا مفہوم آ گیا ہے اور اس پر ان اثرات اور خیالات کا اضافہ ہے جو گیتا کے مطالعے سے میرے دل پر مرتسم ہوئے۔ اس عمل کا نتیجہ یہ ہوا کہ اکثر شلوکوں کی ترتیب بدل گئی ہے، مقدم موخر اور اور موخر مقدم ہو گئے ہیں''۔ (ص ۲۶)

گیتا جی کے مطالعے نے ان کے دل و دماغ کو متاثر کیا تب ہی انہوں نے ہندوؤں کے اس مقدس صحیفے کو اردو اشعار میں منتقل کیا۔ یہ کوئی آسان کام نہیں تھا۔ ذہنی جوش و ولولے نے انہیں اس حد تک منہمک کر دیا کہ چھ سات ہفتوں میں انہوں نے اسے مکمل کر دیا۔ اتنی کم مدت میں کسی مذہبی صحیفے کو ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اس میں کچھ خامیاں بھی راہ پا گئیں۔ یہاں ان کی نشان دہی کرنا ہمارا مقصد نہیں بلکہ یہ بتانا ہے کہ وقتاً فوقتاً جن مسلم حضرات نے یہ کارنامے انجام دیے، انہیں گیتا جی اور بھگوان شری کرشن جی مہاراج سے کتنی عقیدت تھی۔ یہ والہانہ عقیدت کے ہی اثرات ہیں کہ صدیوں سے قوموں کے شعرا و ادبا مذہبی رہنماؤں کی شان میں گیت گاتے آئے ہیں۔ انہی اشلوکوں کا اثر صاحب کا ترجمہ پیش خدمت ہے:

یہ موقع نہیں رنج کا نیک خو
تری گفتگو ہے عجب گفتگو
بظاہر تو باتیں ہیں داناؤں کی
نہ یہ آگہی ہے نہ دانش وری

جو دانا ہیں زندوں کو روتے نہیں
مردوں کے لیے جان کھوتے نہیں
نہ میں اور نہ تو اور نہ ان میں کوئی
نہ معدوم تھا اور نہ ہوگا کبھی
نہ کچھ ابتدا ہے نہ کچھ انتہا
مگر پھر بھی ہے ایک تانتا لگا
جو ہے ہست، جینا اسے ناگزیر
نہیں کوئی تخصیص برنا و پیر
لڑکپن جوانی بڑھاپے کی طرح
اک آنے کی ہے ایک جانے کی طرح
بدلتی ہے مسکن فقط زندگی
بلندی کبھی ہے تو پستی کبھی
سمجھتے ہیں یہ نکتہ عاقل جو ہیں
نہیں ان سے مطلب کہ جاہل جو ہیں
مگر وہ حواسوں کی ہے زندگی
عناصر کی ہے جس میں غارت گری
جو محسوس کرتی ہے گرم اور سرد
خوشی اور غم کی ہے جس میں نبرد
وہ ہے کم ثبات اور تغیر پذیر
نہیں ہوتے ذی فہم اس کے اسیر
انہیں کی طرح تو بھی برداشت کر
انہیں کی طرح اس کی پرداخت کر
حواسوں کا پہرا نہیں روح پر

خوشی کی حکومت نہ غم کا اثر
توانا ہے اور مطمئن متصل
دوام اس کی جولاں گہ مستقل
ادھر تو جو ہونی ہے ہو اور ہو
نہیں ربط ادھر نیست سے ہست ہو
وہ سمجھے، حقیقت یہ جن پر کھلی
یہاں کیا ہے پائندہ، کیا رفتنی
فنا آتما ہو یہ ممکن نہیں
مکاں جسم ہے، آتما ہے مکیں
یہی جلوہ گر ہے یہی جلوہ زا
جلاتے ہیں جیسے دیے سے دیا
یہ کم ہو کہ ٹھہرے کہ بدلے محال
کوئی اس کے قبضے سے نکلے، محال
فنا جن پہ حاوی ہے اجسام ہیں
جو اس کا تاسف کریں، خام ہیں
غلط ہے سراسر غلط انتشار
کمر باندھ ارجن پے کار زار
نہ قاتل کوئی ہے نہ مقتول ہے
اَمر آتما، ما سوا بھول ہے
کبھی آتما مار سکتی نہیں
یہ خود موت سے ہار سکتی نہیں
یہ دائم ہے پیدا ہوئی ہی نہیں
جو پیدا نہ ہو وہ فنا بھی نہیں

نہ تھا کوئی لمحہ کہ جب یہ نہ ہو
اچنبھا ہے اول کہ آخر کہو
ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے
فقط جسم مرتا ہے مرتا رہے
جو سمجھا کہ یہ ختم ہوتی نہیں
کبھی اونگھتی اور سوتی نہیں
خود اس میں ہے خوراک اس کی نہاں
جہاں میں ہے لا فانیت کا نشاں
نہ کاٹے کٹے اور نہ مارے مرے
تو پھر قتل کا کون دعوے کرے
جسے موت سے کچھ علاقہ نہیں
اسے مارنا کھیل ٹھٹھا نہیں
بدلتے ہیں جس طرح رخت کہن
یہی روح کا جسم سے ہے چلن
لباس آج یہ اور کل دوسرا
بدلتا رہے گا، بدلتا رہا
کوئی ضرب اس پر نہ ہو کارگر
نہ آگ اور پانی سے پہنچے ضرر
ہوا سے یہ پژمردہ ہوتی نہیں
کرو کچھ جتن مردہ ہوتی نہیں
نئ موت ہو یا نئ زندگی
وہی روح ہے اور وہی روح تھی
ولادت کا ٹھہرا نتیجہ وفات

یوں ہی موت میں جلوہ گر ہے حیات
مقدر ہے جو کچھ نہ ہونا غلط
وہ ہوکر رہے گا تو رونا غلط

اب ڈاکٹر شان الحق حقی کا منظوم ترجمہ ملاحظہ فرمائیں جو گیتا جی کے انھی اشلوکوں پر مبنی ہے:

۱۱۔ بڑی بیدادمغزی کی ہیں باتیں تم نے جو کی ہیں
مگر اس رنج بے ہنگام کا حامی نہیں ہوں میں
جو عاقل ہیں کسی کے مرنے جینے پر نہیں کڑھتے
ہے کچھ مرنا نہ کچھ جینا، نظر کے ہیں سب دھوکے
۱۲۔ نہ تھا کوئی سمے جب میں نہ تھا یا تم نہ تھے پیدا
نہ ہم پر نیستی کا کال آیا نہ آئے گا
۱۳۔ اسی اک جسم میں جب جاں بدلتی ہے نیا چولا
وہی بالک، وہی گبرو جواں اور پھر وہی بوڑھا
تو مرنے پر بھی پائے گی نیا جسم اس میں حیرت کیا
جو حق آگاہ ہے ہرگز وہ اس میں شک نہیں کرتا
۱۴۔ ہیں سکھ دکھ آنی جانی شئے کہ جیسے گرمی اور جاڑا
جنھیں محسوس بھی کرنا، جنھیں برداشت بھی کرنا
تو سہہ لو تم بھی جو کچھ پیش آئے جی کڑا کرکے
کہ تم کُنتی کے جائے ہو، بھرت کے سُورما بیٹے
۱۵۔ جو دکھ سکھ میں رہے ثابت قدم وہ سب سے اچھا ہے
اسی کے نام سے مُکتی، اسی کا بول بالا ہے
۱۶۔ نہ ہوگی نیست کو ہستی، نہ ہوگا ہست کو مرنا
یہی تقدیر ہے ان کی، یہی ایماں ہے عاقل کا
۱۷۔ جو ہے اس جسم میں ساری فنا کا ڈر نہیں اس کو

بقا اس کا مقدر ہے، اسے مانو، اسے سمجھو

۱۸۔ یہ جو اجساد فانی ہیں نفوس جاودانی ہیں
سدا موجود و لا محدود ہستی کی نشانی ہیں
یہ ارواح مجسم ہیں فنا سے ماورا سُن لو
تو کیا باک ان سے لڑنے میں بھرت کے نام لیوا کو؟

۱۹۔ کسی نے مارا اور کوئی مرا، جو یہ سمجھتا ہے
وہ ناداں ہے، نہ کوئی مارتا ہے اور نہ مرتا ہے

۲۰۔ نہیں ہیں روح کو جنم اور مرن، جو ہے رہے گا وہ
بظاہر قتل ہوجائے مگر پھر بھی جیے گا وہ

۲۱۔ جو کوئی روح کو بے جنم اور بے اَنت مانے گا
وہ مارے گا تو کس کو پارتھا، کون اس کو مارے گا

۲۲۔ جہاں میں جس طرح سے لوگ پوشاکیں بدلتے ہیں
پرانا جسم تج کر یوں ہی جسم نو میں ڈھلتے ہیں

۲۳۔ کسی ہتھیار سے بھی روح زخمی ہو نہیں سکتی
اسے پھونکیں، ڈبوئیں آگ پانی میں نہیں شکتی

۲۴۔ نہیں ممکن شکستہ ہو، گھلے، سوکھے، سمٹ جائے
ابد کا سلسلہ ہے یہ، نہیں ممکن کہ کٹ جائے

۲۵۔ نہیں ہیئت کوئی اس کی، بدلتی ہے، نہ مٹتی ہے
تو پھر اک جسم کے پیچھے یہ ماتم کیا ضروری ہے

۲۶۔ گماں ہے گر تمھیں ہے روح مرتی اور جنم لیتی
تو اے بلوان کڑھنا تو روا تم کو نہیں پھر بھی

۲۷۔ جو جیتا ہے مرے گا، جو مرا پھر اس کو جینا ہے
تو اپنے فرض سے منہ موڑنے کا پھر سبب کیا ہے

(باقی)

سفرنامۂ شبلی کی علمی اور سماجی جہتیں

ڈاکٹر محمد صہیب

اردو میں سفرنامے کی روایت بہت قدیم نہیں ہے۔ یوسف کمبل پوش کے سفرنامے ''تاریخ یوسفی'' (۱۸۴۷ء) کو اس کا نقطۂ آغاز قرار دیا جاتا ہے، جس کو نول کشور نے ''عجائبات فرنگ'' کے نام سے ۱۸۷۳ء میں شائع کیا تھا۔ موخرالذکر نام ہی نے شہرت حاصل کی۔ لیکن شبلی کے دور تک آتے آتے یہ واضح ہو گیا تھا کہ سفرنامے محض ''مسافر'' کی جذباتی تسکین کا ذریعہ نہیں ہوتے بلکہ اس کے ذریعے جغرافیائی، تاریخی اور سب سے بڑھ کر سماجی اور تہذیبی حالات پر روشنی پڑتی ہے۔ نظم ونسق اور اقتصادیات بھی سفرنامے کا لازمی حصہ ہوتے ہیں۔

ایک مسافر کے قلم بند حالات کو ''سفرنامے'' کے درجے تک پہنچنے کے لیے جن عناصر کی ضرورت ہوتی ہے، مولانا شبلی کے مطابق یہ ہیں:

۱) ملک کی اجمالی حالت۔ ۲) انتظام کا طریقہ۔ ۳) عدالت کے اصول۔ ۴) تجارت کی کیفیت۔ ۵) عمارتوں کے نقشے۔

سفرنامے کی مندرجہ بالا خصوصیتوں کو بیان کرنے کے بعد مولانا شبلی عالمانہ انکسار کے ساتھ اپنے سفرنامے پر خود ہی تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''ان میں سے ایک چیز بھی اس سفرنامہ میں نہیں البتہ معاشرت اور علمی حالت کے متعلق معتد بہ واقعات ہیں اگرچہ وہ بھی اس تفصیل کے ساتھ نہیں جس قدر ہونے چاہئیں، غرض جو شخص سفرنامہ کو سفرنامہ کی حیثیت سے دیکھنا چاہتا ہے وہ اس کتاب سے پورا لطف نہیں اٹھا سکتا، البتہ جن لوگوں کو اسلامی ممالک کے معمولی

شمس نگر، کریلا باغ، الٰہ آباد۔ (Mob: 9415881297)

واقعات میں بھی مزہ آتا ہے ان کی دعوت میں یہ ماحضر پیش کیا جاسکتا ہے‘‘۔(۱)

علامہ شبلی کے سفرنامے میں سیاحت کے عنصر کا فقدان ہے یا وہ تسخیر کائنات کے جذبے سے عاری ہے اور اس طرح وہ فنی نقطۂ نظر سے کمال کو نہیں پہنچتا۔ ان سب کے باوجود مرزا حامد بیگ یہ کہے بغیر نہ رہ سکے کہ شبلی کا سفرنامہ اپنے طرز کا اولین سفرنامہ ہے، جس میں معلومات بھی فراہم کی گئی ہیں، نجی یادداشتیں بھی ہیں، جو آپ بیتی کا خام مواد بھی بن سکتی ہیں۔ معاشرت بھی ہے اور حاکم وقت کا جلال بھی۔(۲)

۱۸۷۷ء میں روم اور روس کے درمیان جنگ ہوئی، ہندوستان بلکہ ساری اسلامی دنیا نے ترکی کا ساتھ دیا، انگریزوں نے بھی حمایت کی ہندوستانی مسلمانوں نے چندہ کرکے ترکی کو رقم بھیجی۔ علامہ شبلی بھی اس مہم میں پیش پیش تھے اور ایک خطیر رقم جمع کرکے ترکی کے سفیر کے ذریعے قسطنطنیہ بھیجی۔ یہیں سے ترکوں کی محبت شبلی کے دل میں گھر کر گئی اور ایک ایسی داستان لکھ گئی جس کو تاریخ نے ''سفرنامۂ روم ومصر وشام'' کے نام سے محفوظ کرلیا۔ یہ ثابت ہے کہ شبلی کے علمی شغف، اصل مآخذ تک رسائی کی تگ ودو اور کتب خانوں کے نہاں خانوں سے علمی جواہر ریزے کی بازیافت نے ان کو ترکی، مصر اور شام کے سفر پر آمادہ کیا، لیکن ایک سبب اور بھی ہے جو لوگوں کی نگاہ سے اوجھل تھا، اور وہ تھا شبلی کا ترکی سے والہانہ تعلق اور ان کی جذباتی وابستگی، مولانا شبلی کے شاگرد عزیز اور ان کے ہمراز علامہ سید سلیمان ندوی نے اس پس منظر کی طرف متوجہ کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''ترکوں کی محبت نے ان کے دل میں گھر کیا اور اسی محبت میں ترکی کا سفر کیا، اور وہ عشق جواب تک صرف گفتار کے ذریعہ تھا دیدار سے وہ اور دہ چند بڑھ گیا، ان کو ترکوں کے کوکبۂ جلال میں بدر وحنین کے جلوے نظر آتے تھے......مولانا کا ترکی کا سفر خواہ کتنے ہی علمی پردہ میں چھپا ہو، پھر بھی اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ وہ ہندوستان اور ترکی کے درمیان تعلقات کی پہلی کڑی تھی''۔(۳)

علامہ شبلی کے احاطۂ تحریر میں جب اسلامی علوم یا تہذیب وتمدن جیسے موضوعات ہوتے ہیں اور وہ حدیث، تاریخ اور سیرت پر کلام کررہے ہوتے ہیں تو ان کے پیش نظر مستشرقین کی تحریریں اور ان کے افکار ونظریات بھی ہوتے ہیں، وہ یورپی مورخین کے منفی نقطہ ہائے نظر کی طرف اشارے بھی

کرتے چلتے ہیں اور جہاں ضرورت ہوتی ہے، دلائل کی روشنی میں ان کا رد بھی کرتے ہیں۔

شبلی کا یہ اسلوب ان کے سفرنامے میں بھی نظر آتا ہے، ترکی کے حوالے سے بھی انہوں نے یورپی مورخوں اور سیاحوں کے مخصوص فکری رویے اور ان کی تحقیق میں تہ نشین تعصّبات کا تذکرہ کیا ہے۔ مولانا شبلی کو اس کا قلق تھا کہ یورپ کے سیاحوں نے ترکی کے حالات کو قلم بند کرنے میں انصاف سے کام نہیں لیا، ترکی کی پسماندگی، قرضے سے اس کی گرانباری، عصری علوم سے ناواقفیت اور آلات حرب کے سلسلے میں یورپ پر اس کے انحصار کے تذکرے بار بار کیے جاتے ہیں لیکن ترقی کی طرف اس کے بڑھتے قدم کی ستائش نہیں ہوتی، کوئی یہ بتاکے نہیں دیتا کہ زراعتی بینک بھی قائم کیے گئے۔ فوجی قوت میں ترقی ہوئی ہے، تعلیم کا نظام بہتر ہوا ہے، مدارس کی تعداد ۹۶ سے ۴۰۵ تک پہنچ گئی ہے، کالج بھی قائم کیے جانے لگے ہیں اور اس طرح ترکی ترقی کی راہ پر لگ گیا ہے۔ اگر کسی یورپی سیاح نے عام اسلوب سے ذرا ہٹ کر لکھا بھی تو اس کو سند اعتبار عطا نہ ہوئی۔

سفرنامہ تاریخی تسلسل کا ایک اہم جز ہے اور ممالک واقوام کے تعارف کا ایک دلچسپ ذریعہ بھی، لیکن جس قدر دلچسپ ہے، اتنا ہی اس میں غلطیوں کے امکانات بھی ہیں، یہ غلطیاں کیوں ہوتی ہیں؟ مولانا شبلی نے اس کے اسباب پر بھی غور کیا ہے اور اس نتیجے پر پہنچے کہ مندرجہ ذیل عناصر ہوتے ہیں جن سے سفرنامے کی معروضیت متاثر ہوتی ہے اور غلطیوں کا امکان بڑھ جاتا ہے:

۱۔ جزئیات سے کلیات کا کام لینا۔ ۲۔ جس ملک کا سفر کیا جاتا ہے، سفر کرنے والا پہلے سے ہی اس ملک کے لیے دوستانہ یا مخالفانہ خیال قائم کر لیتا ہے۔ ۳۔ سیاح کا راوی کی پروا نہ کرنا کہ وہ ثقہ ہے یا غیر ثقہ، روشن ضمیر ہے یا متعصب، دقیق النظر ہے یا ظاہر بیں۔

بہر حال شبلی نے اپنے سفرنامے کے دیباچے ہی میں یہ وضاحت کر دی ہے کہ ان کا سفرنامہ یورپ کے عام طرز اور اسلوب سے مختلف ہوگا:

> ”میں نے اگرچہ اس کتاب میں ترکوں کی تمدنی یا ملکی حالت سے کچھ بحث نہیں کی ہے اور نہ اس قسم کی بحث میرے منصب وحالت کے لحاظ سے مناسب تھی تاہم اس کتاب کو پڑھ کر ناظرین کے دل میں ترکوں کی تہذیب وشائستگی کا جو درجہ قائم ہوگا وہ اس سے مختلف ہوگا جو یورپ کے عام لٹریچر سے ظاہر ہوتا ہے“۔ (۴)

یکم مئی ۱۸۹۲ء کو پروفیسر آرنلڈ کی معیت میں مولانا شبلی کا سفر شروع ہوتا ہے، سفر کے دوران پروفیسر آرنلڈ نے شبلی سے عربی پڑھنی شروع کی۔ جہاز میں اسپین کا ایک عیسائی بھی تھا، جس کو آرنلڈ کا عربی پڑھنا ناگوار گزرتا، وہ آرنلڈ کے پاس آتا اور عربی حروف کو توڑ مروڑ کر ادا کرتا اور تحقیر آمیز لہجے میں کہتا کہ یہ زبان اونٹوں کی زبان ہے۔ تعصب کا یہ منظر دیکھ کر شبلی کو بہت رنج ہوا۔

۷ رمئی ۱۸۹۲ء کو مولانا شبلی کا جہاز عدن پہنچا، یہاں ان کا سابقہ سالی قوم سے پڑا، ان کی زبان عربی تھی، لیکن غیر فصیح عربی بول رہے تھے، دو چار معمولی الفاظ کے علاوہ شبلی کو کچھ بھی سمجھ میں نہ آیا۔ اور ایک عجیب منظر دیکھا کہ اس قوم کے لڑکے ڈونگیوں پر سوار ہو کر جہاز کے پاس آتے ہیں، ناچتے گاتے ہیں، انعام کے طور پر دو چار آنے اگر ان کو کوئی دینا چاہتا ہے تو ان سکوں کو سمندر میں اچھال دیتا ہے اور یہ لڑکے فوراً سمندر میں ان پیسوں کے لیے جست لگا دیتے ہیں اور غوطہ مار کر نکال لاتے ہیں۔ شبلی کو یہ سب دیکھ کر بڑی کوفت ہوئی، شرم سے سر جھک گیا اور آنسو جاری ہو گئے کہ عرب جیسی غیرت مند قوم ابتذال کی اس سطح پر اتر آئی ہے۔ لیکن اس وقت شبلی کو تسکین ہوئی جب انہیں بتایا گیا کہ یہ قوم عربی تو بولتی ہے لیکن عربی النسل نہیں ہے۔

اردو زبان کی ہمہ گیری پر اس وقت شبلی کو حیرت بھی ہوئی اور مسرت بھی، جب ۱۳ رمئی کو جہاز سوئز پہنچا۔ مصری عرب کھانے کا سامان بیچنے کے لیے لے کر آئے۔ ایک شخص شبلی کی طرف بڑھا اور اردو میں ان سے گفتگو کرنے لگا، شبلی نے جب اس سے پوچھا کہ ہندوستان کا سفر کیا ہے؟ جواب تھا نہیں، اس نے ہندوستان کی صورت نہیں دیکھی ہے۔

یورپی اور ایشائی تمدن میں جو فرق ہے، شبلی کو وہ فرق قسطنطنیہ میں نمایاں طور پر نظر آیا۔ غلطہ یورپ کا ایک ٹکڑا معلوم ہوتا ہے۔ سڑکیں ہموار، صاف ستھری، استنبول جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے، وہاں کی سڑکیں اس قدر ناصاف اور ناہموار کہ چلنا مشکل۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ابن بطوطہ نے اس کے برعکس "غلطہ" کو "ناصاف" اور "میلا" بتایا ہے۔ شبلی نے اس فرق کے بارے میں جب دریافت کیا تو انہیں بتایا گیا کہ استنبول میونسپلٹی کے ٹیکس بہت کم ہیں، اس کے علاوہ بہت سی چیزوں میں ٹیکس معاف ہیں۔ اس کے برعکس غلطہ کے یورپی سوداگر اپنی مرضی سے بڑے بڑے ٹیکس ادا کرتے ہیں، جس کو میونسپلٹی فیاضی سے ان پر خرچ کرتی ہے۔ یورپیوں کے صفائی کے اس اہتمام کو دیکھ کر شبلی کو رشک بھی ہوا

اور مسلمانوں کی حالت زار پر افسوس بھی۔

ترکی میں قیام کے دوران شبلی نے ترکی زبان پڑھنی شروع کی۔ ان کے احباب ہی ان کے اساتذہ تھے۔ شبلی نے جب ترکی لٹریچر پڑھنا شروع کیا تو انہیں اندازہ ہوا کہ ترکی کا قدیم لٹریچر اپنی بعض خصوصیتوں میں اردو ادب کے قدیم اسلوب سے مماثلت رکھتا ہے۔ رنگین، پر تکلف اور استعارات سے گرانبار۔ لیکن اب جس طرح اردو کا اسلوب بدل رہا ہے، اسی طرح ترکی ادب بھی سادگی، بے تکلفی اور برجستگی کی طرف گامزن ہے۔ اور اسی نئے طرز پر ہی کتابیں لکھی جا رہی ہیں۔ اس طرز جدید کے موجد کمال بک، حامد بک اور پروفیسر ناجی وغیرہ ہیں۔

تعلیم کے قدیم و جدید تصورات کے درمیان کشمکش کی صورت شبلی کو ترکی شام اور مصر میں بھی نظر آئی۔ قدیم طریقۂ تعلیم سے محبت کے باوجود اس کی ابتری اور اس کے مضر اثرات بھی بیان کیے ہیں۔ انہوں نے ہندوستان اور اسلامی ممالک میں قدیم تعلیم کے طرز و نہج کے ساتھ اس کے نقص کو یکساں پایا۔ ہندوستان کے سلسلے میں تو شبلی صبر کے "جواز" کے قائل ہیں، لیکن اسلامی سلطنتوں میں پرانے طرز تعلیم کے تنزل کو دیکھ کر انہیں سخت صدمہ پہنچا اور اس سلسلے میں وہ کسی طرح کی تاویل کو روا نہیں رکھتے۔

شبلی جدید تعلیم کے نہ صرف حامی تھے بلکہ اس کے نقیب تھے۔ جدید تقاضوں کے پیش نظر نصاب کی ترتیب کے قائل تھے۔ ان کی فکر یہ تھی کہ جب تک دوسری اقوام کی تاریخ یا ان کی زبان یا پھر ان کے ایجاد کیے ہوئے علوم تک رسائی نہیں ہوگی، اس وقت تک تبلیغ و ارشاد کا فریضہ مکمل طور پر ادا نہیں ہوسکتا۔ اور نہ ہی دنیا کو برتنے کا سلیقہ آسکتا ہے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ شبلی کے یہاں قدیم تعلیم سے انحراف و احتراز ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ شبلی پرانے تعلیمی نظام کی حمایت و حفاظت کو اپنا قومی فریضہ سمجھتے تھے۔

شبلی کے مطابق مکتبہ حربیہ ایسا پہلا کالج ہے، جہاں سے ترکی میں جدید تعلیم کا دور شروع ہوتا ہے۔ سلطان محمود نے ۱۲۵۰ھ میں اس کو قائم کیا تھا۔ سلطان محمود کے بعد سلطان عبدالمجید نے جدید تعلیم کو زیادہ وسعت دی۔ تین لاکھ پونڈ سے بڑھا کر آٹھ لاکھ پونڈ سالانہ تعلیمی بجٹ کر دیا گیا۔ مدارس اور کالج قائم کیے گئے۔ تعلیم کے شعبہ بڑھائے گئے۔ نصاب میں توسیع کی گئی، اسلامی علوم کے ساتھ فرنچ، یونانی اور ارمنی زبانیں لازم کی گئیں۔ تاریخ، جغرافیہ، پولیٹکل سائنس، اکونامکس جیسے مضامین

شامل کیے گئے۔اور تعلیم کے چار درجے مقرر کیے گئے۔

۱۔ ابتدائیہ۔ ۲۔ رشدیہ۔ ۳۔ اعدادیہ۔ ۴۔ اعدادیہ کے بعد کالج کی سطح پر تعلیم۔

ترکی میں جدید علوم کی تعلیم ان کی اپنی زبان میں دی جاتی ہے۔شبلی نے اس ضمن میں یہ اصول بھی بیان کیا کہ کسی قوم کی ترقی کے لیے ضروری ہے کہ اس کو اس کی زبان میں تعلیم دی جائے، چاہے وہ علوم قدیم ہوں یا جدید،اس لیے کہ تاریخ میں ایسی کوئی نظیر نہیں ملتی کہ کسی قوم نے ترقی کی ہو اور اس نے علوم دوسری زبان میں حاصل کیے ہوں۔انگریزوں نے بھی اسی راہ سے ترقی کی ہے۔لاطینی اور یونانی سے انگریزی میں جب ترجمے ہونے لگے اور انگریز علم کی نئی دنیا سے متعارف ہوئے اور اس کے علوم کو جذب کیا تب کہیں جا کر دنیا کی ترقی یافتہ قوم قرار پائے۔اسی تاریخی تجربے کی بنیاد پر شبلی نے ترکی کے طرز تعلیم کو اس کی ترقی کے لیے خوش آیند بتایا ہے۔

چونکہ جدید طریقۂ تعلیم کی طرف ترکی کے اقدام کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا اور تعلیم کے سلسلے میں اصلاحات جاری تھیں،اسی لیے شبلی نے بھی اپنے سفرنامے میں بعض اہم گوشوں کی طرف متوجہ کیا اور ان کمیوں کی نشاندہی کی ہے جن کے ازالے کے بغیر جدید تعلیم کا مقصد حاصل نہیں ہوسکتا:

۱۔کالج بلکہ شہر میں کہیں بھی علمی مذاکرہ یا انجمن کا نہ ہونا۔جس کا اثر یہ ہے کہ تعلیم یافتہ لوگوں میں زندہ دلی اور بلند نظری پیدا ہوسکی جو نئی تعلیم کا لازمہ ہے۔ ۲۔کالجوں اور اسکولوں کا دارالخلافت تک ہی محدود رہنا،عام شہروں میں اوسط درجے کے ہی مدارس ہیں۔ ۳۔کالج اور اسکول کا صرف حکومت کی طرف سے قائم کیا جانا۔قوم نے اسکول اور کالج قائم کرنے کی طرف توجہ نہیں کی ہے۔ایک بھی قومی کالج کا نہ ہونا جدید تعلیم کے مقصد کو نقصان پہنچا سکتا ہے۔اس سلسلے میں شبلی کی یہ تحریر ملاحظہ ہو:

> ''دارالسلطنت میں ایک بھی قومی کالج نہیں،کوئی گورنمنٹ گو کتنی مقتدر اور دولت مند ہو لیکن تمام ملک کی علمی ضرورتوں کی کفیل نہیں ہوسکتی۔اگر ہو بھی تو چنداں مفید نہیں،جس قوم کی تمام ضرورتیں گورنمنٹ انجام دیا کرتی ہے،اس کی دماغی اور روحانی قوتیں مردہ اور بے کار ہو جاتی ہیں،یورپ میں جو عظیم الشان علمی کارخانے پھیلے ہوئے ہیں ان میں زیادہ تر قوم کا حصہ ہے،انگلستان کی مشہور یونیورسٹیاں،کمبرج اور آکسفورڈ قومی ہی کوششوں سے قائم ہوئی ہیں''۔(۵)

قسطنطنیہ میں تین مہینہ شبلی کا قیام رہا۔اس مدت میں انہوں نے یہاں کے مدارس اور کالج کے ساتھ کتب خانے بھی دیکھے۔شبلی نے ان کتب خانوں کے کوائف بھی اختصار سے لکھے ہیں لیکن اس قدر جامعیت کے ساتھ کہ ترکی کے کتب خانوں کی پوری کیفیت قاری کے سامنے آجاتی ہے۔شبلی ان کتب خانوں کی ظاہری حالت، کتابوں کے رکھ رکھاؤ اوران کے انتظام کو دیکھ کر مطمئن نہ ہوئے اور اس کا شکوہ بھی انہوں نے کیا۔ایک اہم لائبریری ''کتب خانہ حمیدیہ'' جوسلطان المعظم کی یادگار بھی ہے، کے بارے میں لکھتے ہیں یہ کتب خانہ دوسرے کتب خانوں سے ممتاز ہونے کے باوجود الٰہ آباد کی پبلک لائبریری کی برابری نہیں کرسکتا(٦)۔البتہ کتابوں کو دیکھ کرانہیں اندازہ ہوا کہ امرا کا طبقہ اعلیٰ درجے کا تعلیم یافتہ تھا،اس لیے کہ کتب خانوں میں ان کی ذاتی تصنیفات یاان کے ہاتھ کی لکھی ہوئی کتابیں موجود تھیں۔ان کتب خانوں میں ایسی کتابیں ہیں جو دوسرے کتب خانوں میں نہیں ملتی ہیں۔شبلی نے نادر کتابوں میں سے چند کے نام بھی دیے ہیں۔

کتابوں کی اشاعت حکومت کی تفتیش اور معاینے کے بغیر نہیں ہوسکتی،حکومت کے اس قانون کا سبب یہ تھا کہ عیسائیوں نے قرآن میں تحریف کر کے اسے شائع کر دیا تھا۔شبلی نے حکومت کے اس احتیاطی قدم کی تعریف کی ہے،لیکن تفتیشی مراحل کی آڑ میں کتابوں کی اشاعت کے سلسلے میں حکومت کی سختی کو قابل اعتراض بتایا ہے۔شبلی نے اخبارات کے آزاد نہ ہونے اوراس کے پس منظر کو بھی بیان کیا ہے۔

شبلی کو قسطنطنیہ کی معاشرت اور طرز زندگی کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا تھا۔علما کے ساتھ ارباب سیاست سے بھی ملاقات رہی۔عوام سے روزمرہ کے معاملات بھی رہے،امیر وغریب ہر طرح کے لوگوں سے سابقہ پڑا۔شبلی نے سبھی کو ایک ہی وضع کا پایا،اخلاق میں اچھے،طبیعت میں فیاض اور خوش سلیقہ،ترکوں کے جن اوصاف سے شبلی بے حد متاثر ہوئے اوران کو قابل تقلید ٹھہرایا،وہ یہ ہیں:

۱۔خوش سلیقہ ہونا،معمولی حیثیت کا آدمی بھی جس صفائی اور خوش سلیقگی سے رہتا ہے، ہندوستان کے بڑے سے بڑے آدمی کو بھی وہ نصیب نہیں۔ ۲۔شان وشوکت سے گریز،بڑے بڑے وزرااور امرا بھی بازار میں نکلتے ہیں تو ایک عام آدمی کی طرح نکلتے ہیں۔وزیر اعظم کے ساتھ سواری پر صرف دوتین آدمی ہوتے ہیں۔ ۳۔عورتوں کا تعلیم یافتہ ہونا۔عورتوں کی تعلیم کی طرف خصوصی توجہ ہے۔

شبلی نے ترکی کے علمی اور معاشرتی احوال کو تفصیل سے لکھا ہے۔ سلامق سلطانی (سلطان کو سلام کرنے کی رسم) کا وہ منظر بھی اسی تفصیل کا حصہ ہے جس کو شبلی نے بہت قریب سے دیکھا تھا، جس میں سلطان کا جلال بھی تھا اور سلطنت کا شکوہ بھی۔ نامور ترکی جنرل غازی عثمان پاشا سے بھی ملاقات ہوئی۔ ایک دو ملاقات میں عثمان پاشا شبلی سے بہت متاثر ہوئے، انہیں کی کوششوں سے شبلی کو سلطان کی طرف سے ''تمغۂ مجیدی'' عطا ہوا۔ شبلی نے تعلیم کے سلسلے میں ترکوں کی پیش رفت کو سراہا ہے اور ان کی معاشرت کے متعدد اوصاف کو تحسین کی نگاہ سے دیکھا ہے، لیکن ان سب کے باوجود ترکی کی فضا میں بھی شبلی کو وہی کیفیت نظر آئی جو عالمی سطح پر مسلم ماحول میں عام طور پر دیکھی جاتی ہے...... فکری پراگندگی، تعلیم سے بے اعتنائی، خاص قسم کا طرز زندگی اور رکھ رکھاؤ، تجارت وصنعت میں سست روی۔ اس سلسلے میں مولانا شبلی کا یہ تبصرہ ملاحظہ ہو:

> ''ترکی کے سفر سے جو اثر میرے دل پر ہوا اس کا یہاں ظاہر کرنا چنداں ضرور نہیں، اس سفر نامہ کے پڑھنے سے خود اس کا پتہ لگ سکتا ہے البتہ اس قدر کہنا ضرور ہے کہ سلطنت کی حیثیت سے اگر قطع نظر کی جائے تو مسلمانوں کی حالت وہاں بھی کچھ زیادہ مسرت اور اطمینان کے قابل نہیں ہے بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ بہت سی باتوں میں ہندوستان کے مسلمانوں کے قریب قریب ہے، صنعت سے ان کو کچھ واسطہ نہیں، تجارت میں ان کا بہت کم حصہ ہے، معمولی دکاندار تک یہودی یا عیسائی ہیں، پرانی تعلیم نہایت ابتر ہے اور ہوتی جاتی ہے، نئی تعلیم کے متعلق جو شکایت یہاں ہے وہاں بھی ہے، پرانی تہذیب اور نئی تہذیب میں ابھی تک رقابت ہے اور دونوں سے مل کر کوئی مرکب مزاج پیدا نہیں ہوا ہے، پرانے خیال والے ابھی تک زمانہ کی رفتار سے بے خبر ہیں، نئے مذاق کے لوگ جس قدر کہتے ہیں کرتے نہیں ہمت، غیرت، جوش، عزم، استقلال کے بجائے کل قوم پر (من حیث الاغلب) افسردگی سی چھائی ہوئی ہے جو شخص جس حال میں ہے اس پر قانع ہے موجودہ حالت تو یہ ہے، **و لعل اللہ یحدث بعد ذلک امرا**''۔(۷)

چونکہ شبلی کا مطمح نظر ترکی کی تعلیم یا اس کے سماجی حالات تھے، سیاست سے، اگرچہ وہ سماجیات

ہی کا حصہ ہے، انہوں نے کچھ بھی تعرض نہیں کیا، اس لیے منقولہ بالا تبصرے کو بھی اسی زاویے سے دیکھا جانا چاہیے کہ تعلیم کے نہ ہونے پر جو نقصانات ہوتے ہیں اور ان کمیوں کے نتیجے میں معاشرے پر جو سردمہری اور افسردگی طاری رہتی ہے، شبلی نے اسی کیفیت کو بیان کیا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ شبلی ترکی مسلمانوں کو پست حوصلہ سمجھتے تھے یا ان کے جوش وجذبے اور بلند ہمتی کے معترف نہ تھے۔ شبلی ترکوں کے عزم واستقلال اور جوانمردی کے تو اس قدر معترف ہیں کہ انہیں "ترکوں کے کوکبۂ جلال میں بدروحنین کے جلوے نظر آتے تھے"۔

شبلی قسطنطنیہ سے بیروت پہنچے، یہاں چند دن قیام رہا۔ شبلی نے بیروت کے حالات بہت اختصار سے لکھے ہیں لیکن اس کے باوجود اہم اطلاعات اور ضروری تفاصیل آ گئی ہیں۔ شبلی نے بیروت کے لوگوں میں شعروسخن کا مذاق عام پایا، بچہ بچہ شاعری کا ذوق رکھتا ہے۔ البتہ غزل اور مدح سرائی تک ہی ان کا ذوق محدود تھا۔ جدید شاعری کے دیوانے ہیں، قدیم شاعری کو پسند نہیں کرتے۔ شبلی نے جب کسی جاہلی یا اسلامی شاعر کا کلام سنایا تو بدمذاق سمجھا گیا۔ یہاں کی زبان عربی ہے۔ مسلمان، عیسائی اور یہودی سبھی عربی بولتے ہیں اور خود کو بڑے فخر سے عربی النسل سمجھتے ہیں۔ علم سے بے انتہا شغف ہے۔ یہاں کے لوگ اپنے کاروبار یا کاشت کاری سے ذرا بھی فرصت پاتے ہیں تو علمی مشاغل میں لگ جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ علما اور مصنّفین یہاں کثرت سے پیدا ہوئے۔ شبلی کو یہ دیکھ کر افسوس بھی ہوا کہ جو کچھ بھی عملی ترقی یا تصنیفی اور تعلیمی سرگرمیاں ہیں وہ سب عیسائیوں کے ساتھ مخصوص ہیں۔ جو مسلمان اس میدان میں ہیں ان میں سے بیشتر عیسائیوں کی تحریک سے ہیں یا کاروباری معاہدے کے بنا پر ہیں۔ یہاں انہوں نے "الكلية السورية العلمية" (شام کی یونیورسٹی) دیکھا اور اس کے حالات قلم بند کیے۔ بیروت میں انجمنیں کثرت سے ہیں جو بہت فعال ہیں، لیکن ایک بھی انجمن مسلمانوں کی نہیں ہے۔ شبلی نے مشہور انجمنوں کی فہرست ایک نقشے میں دی ہے۔

شبلی بیروت سے روانہ ہوئے اور یافہ (بیت المقدس کا اسٹیشن، جہاں سے بیت المقدس جاتے ہیں) پہنچے۔ بیت المقدس میں ایک ہفتہ قیام رہا۔ مسجد اقصیٰ کی زیارت کی۔ سفرنامے میں مسجد کا طول وعرض اور اس کی عمارت کا قدرے تفصیل سے نقشہ کھینچا ہے۔ یہاں انہوں نے علمی مباحث میں بھی حصہ لیا اور علما سے ملاقاتیں کیں۔ قمامہ گرجا میں بھی گئے۔ عیسائیوں کو وہاں حضرت عیسیٰؑ کی تصویر کی

طرف ٹکٹکی باندھے مراقبے میں مصروف دیکھا۔ صلیب دیے جانے کی جگہ بھی دیکھی۔

شبلی بیت المقدس سے اسکندریہ ہوتے ہوئے قاہرہ پہنچے۔ قاہرہ کے بارے میں شبلی کا تاثر یہ ہے کہ وہاں کے مکانات بلند اور سڑکیں وسیع ہیں۔ لباس اور وضع بدنما ہے البتہ تعلیم یافتہ لوگ کوٹ پتلون پہنتے ہیں، اخلاق میں پستی ہے، معمولی سی معمولی بات پر برگزیدہ شخصیات کا واسطہ دیا جاتا ہے۔ مرد و عورت بہ کثرت بھیک مانگتے ہیں۔

شبلی قاہرہ کے کالجوں میں بھی گئے، وہاں کے اساتذہ سے ملاقاتیں کیں، ان سے تبادلۂ خیال بھی ہوا۔ جدید تعلیم کا نظام رائج ہے لیکن قدیم تعلیمی نظام کے تحت طلبہ کی تعداد زیادہ ہے۔ شبلی نے قاہرہ کے مدارس، طلبہ اور ان کے اخراجات کی تفصیل بھی دی ہے۔

شبلی نے مصر کے متعدد اہم اور بڑے اداروں کا تذکرہ کسی قدر تفصیل کیا ہے، مثال کے طور پر دارالعلوم، مدرسۃ الحقوق، مدرسۃ الترجمہ، مدرسۃ الطب اور مدرسۃ الصنائع وغیرہ۔ شبلی اول الذکر ادارہ ''دارالعلوم'' سے بہت متاثر ہیں، ان کے مطابق دارالعلوم ہی ایک ایسا ادارہ ہے جو تعلیم کے درمیان قدیم وجدید کے فاصلے کو کم کرسکتا ہے۔ تدریس کا طریقہ بھی یہاں مختلف ہے۔ استاذ زبانی لکچر دیتا ہے اور اس کا انداز ایسا ہوتا ہے کہ پورا مضمون دل نشین ہوجاتا ہے۔ اس وقت کے مشہور مصنّفین اور علما اسی ادارے کے تعلیم یافتہ ہیں۔

شبلی دنیا کی قدیم ترین یونیورسٹی ''جامع ازہر'' بھی گئے۔ انہوں نے اس یونیورسٹی کی تاریخ بھی رقم کی ہے۔ مدرسین اور طلبہ کا حال بھی لکھا ہے اور اس کے نظام تعلیم کی حالت زار پر ماتم بھی کیا ہے، لکھتے ہیں:

> ''مجھ کو اپنے تمام سفر میں جس قدر جامع ازہر کے حالات سے مسلمانوں کی بدبختی کا یقین ہوا کسی چیز سے نہیں ہوا، ایک ایسا دارالعلوم جس میں دنیا کے ہر حصہ کے مسلمان جمع ہوں، جس کا سالانہ خرچ دو تین لاکھ سے کم نہ ہو، جس کے طالب علموں کی تعداد بارہ ہزار سے متجاوز ہو اس کی تعلیم وتربیت سے کیا کچھ امید نہیں ہوسکتی تھی لیکن افسوس ہے کہ وہ بجائے فائدہ پہنچانے کے لاکھوں مسلمانوں کو برباد کرچکا ہے اور کرتا جاتا ہے، تربیت و معاشرت کا جو طریقہ ہے اور جس کا میں ذکر کرچکا ہوں اس سے

حوصلہ مندی، بلند نظری، جوش ہمت، غرض تمام شریفانہ اوصاف کا استیصال ہو جاتا ہے''۔(۸)

جامع ازہر کے سلسلے میں شبلی کی یہ تحریر بھی ملاحظہ ہو:

''زیادہ افسوس یہ ہے کہ تعلیم کسی اصول پر نہیں ہے، نہ صف بندی ہے نہ کوئی خاص نصاب ہے نہ امتحان ہوتا ہے نہ ترقی پانے کے لیے کوئی قاعدہ مقرر ہے، افسوس پر افسوس یہ ہے کہ ان ابتریوں کی اصلاح کی کوئی تدبیر نہیں، علی پاشا مبارک نے جو ایک زمانہ میں سر رشتہ تعلیم کا افسر تھا کچھ اصلاح کرنی چاہی تھی، اس پر ازہر کے تمام علما اس کے دشمن بن گئے اور چوں کہ شیخ ازہر کا اثر طلبہ پر منحصر نہیں بلکہ تمام ملک اس کو مذہبی پیشوا تسلیم کرتا ہے، اس لیے پاشائے موصوف کو اغماض کرنا پڑا، ازہر حقیقت میں ایک ملّی طاقت ہے اور خود سلطنت اس کی مخالفت پر بآسانی جرأت نہیں کر سکتی''۔(۹)

شبلی نے مصر کے آثار قدیمہ بھی دیکھے، اہرام، ابوالہول، قلعہ، چاہ یوسف، عجائب خانہ، سجن یوسف اور مولد نبوی کے احوال لکھے ہیں۔ کتب خانوں میں بھی گئے اور مطابع بھی دیکھے۔ شبلی نے مصر کے اس احسان کا اعتراف بھی کیا ہے کہ عربی کتابیں ان چھاپہ خانوں کی وجہ سے ارزاں ہیں۔ مصر کے اخبارات انگریزی حکومت کی وجہ سے آزاد ہیں۔ سیاسیات پر عربی کتابیں کم ہیں اس لیے یہ تصور عام تھا کہ سیاست کے مبادیات و افکار عربی زبان میں ادا نہیں ہو سکتے لیکن شبلی کے مطابق مصر کے اخبارات نے اس تصور عام کو غلط ٹھہرایا۔

شبلی نے مصر کے تھیٹر کا بھی تذکرہ کیا ہے، عیسائی کمپنی کے ایک تھیٹر میں شبلی نے باقاعدہ تماشا بھی دیکھا، جس میں یونان کی ملکہ اور قیصر روم کے درمیان حدود مملکت کے جھگڑے کو دکھایا گیا تھا۔ اس تھیٹر میں شبلی کو سب سے زیادہ جو چیز پسند آئی وہ یہ کہ آخر میں سبھی نے خدیو کی سلامتی کا گیت گایا۔ یہ گیت عربی میں تھا اور گانے والے عیسائی تھے۔

شبلی کے مطابق سفرنامے کا لازمی عنصر زبان بھی ہے، یعنی جس ملک کا سفر کیا جائے سفر نامے میں اس ملک کی زبان سے بھی بحث کی جائے۔ انہوں نے شام اور مصر کے علاقوں میں بولے جانے والے ان نئے عربی الفاظ کی ایک فرہنگ بھی دی ہے، جو اس وقت چلن میں آ گئے تھے۔ اس کی

ضرورت اس لیے پیش آئی کہ بڑے سے بڑا عالم بھی اگر مصر وشام کے سفر پر ہوگا تو اس کو بھی اسی پریشانی کا سامنا ہوگا جو ایک عام آدمی کو ہوگی۔ نئے نئے الفاظ شامل ہو گئے ہیں، الفاظ کے مخففات اس طرح رواج پا گئے ہیں کہ کسی کے بتائے بغیر ان الفاظ تک رسائی نہیں ہوسکتی۔ یہ فہرست اس لیے بھی اہم ہے کہ تاریخی اعتبار سے اپنی نوعیت کی یہ پہلی کوشش تھی۔ علامہ سید سلیمان ندوی کے بقول:

> ''غالباً ہندوستان کی عربی دنیا میں عربی کے نئے نئے الفاظ کی واقفیت کا پہلا براہ راست ذریعہ مولانا کی ہی ذات تھی''۔(۱۰)

شبلی کا سفر علمی اور سماجی حالات تک ہی محدود تھا۔ ملت کا انہیں درد تھا، ترکی کے لیے چندہ کیا، ہندوستان کی آزادی کے لیے انگریز دشمنی میں بھی پیچھے نہ تھے، اپنے اس مزاج کے باوجود انہوں نے ترکی اور عرب ممالک میں جو سیاسی تحریکیں چل رہی تھیں، ان سے صرف نظر کیا ہے۔ ممکن ہے کہ ان کے پیش نظر کوئی سیاسی مصلحت اندیشی رہی ہو۔ اگر ان کے سفر نامے کو بہ نظر عرفان دیکھا جائے تو یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ ہر جگہ سیاسی تذکروں سے اپنے کو الگ رکھنا چاہتے ہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ جو باتیں ان کو پسند نہ آئیں اور انہیں قابل اعتراض سمجھا تو بڑی بے باکی سے ان کو بیان کر دیا ہے۔ شبلی نے بڑی آزادی کے ساتھ اپنے تاثرات رقم کیے ہیں اور اپنے مخصوص طرز اور اسلوب سے سفر نامے کو اس قدر دلچسپ بنا دیا ہے کہ قاری کو ہر سطر میں ایک نئی بات معلوم ہو جانے کا تجسس رہتا ہے۔ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کی یہ بات بالکل درست ہے کہ:

> ''ہمارے نام آور سیاح نے ایک محقق کی نظر سے ان ممالک کو دیکھا اور مسلمانوں کی دلچسپی کا بے حد سامان اپنے سفر نامے میں فراہم کر دیا ہے''۔(۱۱)

یوسف کمبل پوش کا سفر نامہ (اس کی تاریخی اہمیت کے اعتراف کے ساتھ) ایک دائرے تک محدود تھا اور ''غیر مقصدی'' تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ محمد حسین آزاد نے شبلی سے پہلے ایران کے سفر کی روداد ''سیر ایران'' لکھی، جو بقول انور سدید ''مربوط سفر نامہ'' نہیں ہے۔ اس سے پہلے آزاد نے ''وسط ایشیا کی سیاحت'' لکھی جو انور سدید کے مطابق ''سفر نامے کی روایت سے الگ'' ہے۔ البتہ سرسید نے جب بلاد یورپ کا سفر کیا اور شبلی نے ترکی مصر اور شام کا، اور اپنے مشاہدات بیان کیے تو انہیں نگاہ شوق سے دیکھا گیا، پسند کیا گیا اور اسی طرز پر سفر نامے لکھے جانے لگے۔(۱۲)

بہر حال شبلی کا یہ سفر نامہ اپنے طرز کا اولین سفر نامہ ہے، جس میں معلومات بھی فراہم کی گئی ہیں، نجی یادداشتیں بھی ہیں اور جغرافیائی معلومات بھی۔ اور اس طرح انہوں نے سفر نامے کی روایت کے بنیاد گزار کی حیثیت سے اردو کے ادبی سرمایے میں ایک نئی جہت اور ایک نئی سمت کی نشاندہی کی ہے۔

آخر میں یہ عرض کرنا بھی ضروری ہے کہ شبلی کا یہ سفر نامہ اس حیثیت سے بھی تاریخی اہمیت کا حامل ہے کہ ان کی تصنیفات میں یہ ایک ایسی تصنیف تھی، جس کو مصلحت کے پیش نظر محمڈن کالج علی گڑھ سے شائع نہیں کیا گیا۔ مفید عام آگرہ سے اس کا پہلا ایڈیشن ۱۸۹۴ء میں شائع ہوا۔

حواشی

(۱) علامہ شبلی نعمانی، سفر نامہ روم ومصر وشام، دارالمصنّفین، شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ۲۰۱۵ء، ص ۱۴۔ (۲) ڈاکٹر مرزا حامد بیگ، اردو سفر نامے کی مختصر تاریخ، اورینٹ پبلشرز لاہور، ۲۰۱۴ء، ص ۱۱۔ (۳) مولانا سید سلیمان ندوی، حیات شبلی، دارالمصنّفین، شبلی اکیڈمی، ۱۹۹۳ء، ص ۵۸۸، ۲۲۱۔ (۴) علامہ شبلی نعمانی، سفر نامہ روم و مصر وشام، دارالمصنّفین، شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ۲۰۱۵ء، ص ۱۴۔ (۵) ایضاً، ص ۶۴۔ (۶) ایضاً، ص ۸۷۔ (۷) ایضاً، ص ۱۹۔ ۱۸۔ (۸) ایضاً، ص ۱۷۹۔ ۱۷۸۔ (۹) ایضاً، ص ۱۸۰۔ (۱۰) مولانا سید سلیمان ندوی، حیات شبلی، دارالمصنّفین، شبلی اکیڈمی، ۱۹۹۳ء، ص ۲۱۵۔ (۱۱) ظفر احمد صدیقی، شبلی شناسی کے اولین نقوش، دارالمصنّفین، شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ۲۰۱۶ء، ص ۳۳۰۔ (۱۲) ڈاکٹر انور سدید، اردو ادب کی مختصر تاریخ، ایم۔ آر۔ پبلی کیشنز، نئی دہلی، ۲۰۱۵ء، ص ۳۱۰۔ ۳۰۸۔

اخبار علمیہ

”میں دین فطرت کی طرف لوٹا ہوں“

یہ الفاظ ہالینڈ کے نو مسلم سیاست داں جورم وان کلیویرین کے ہیں جو کچھ عرصہ قبل اسلام مخالف ڈچ سیاست داں گیرٹ ولڈرز کی قوم پرست فریڈم پارٹی معروف بہ PVV کے سرگرم رکن تھے اور جن کی زندگی کا ایک ایک لمحہ پارٹی کی حمایت اور اسلام سے بغض وعداوت میں صرف ہوتا تھا۔ ۲۰۱۰ء سے ۲۰۱۷ء تک اسی پارٹی سے رکن پارلیمنٹ رہے اور اسلام اور پیغمبر اسلامؐ کے خلاف انہوں نے خود ایک کتاب لکھنے کی ٹھان لی۔ آدھا حصہ لکھ چکے تھے اور سیرت مبارکہ کے چند پہلوؤں پر تنقیدی نگاہ بھی ڈال چکے تھے کہ اچانک توفیق الٰہی سے ان کی فکر تبدیل ہوگئی اور انہیں احساس ہوا کہ اسلام و پیغمبر اسلامؐ پر جو سوالات واعتراضات قائم کیے ہیں ان میں بیشتر ایسے ہیں جن پر وہ بذات خود عمل پیرا ہیں۔ اب انہوں نے خود ہی ان کا جواب لکھنے کا عزم کرلیا ہے۔ یہ خبر اے ایف پی (ایجنسی فرانس پریس) نے ۵/فروری ۲۰۱۹ء کو جاری کی ہے۔ اس میں جورم کا یہ بیان نقل ہے کہ ”مجھے سخت افسوس ہے کہ میں بے سوچے سمجھے اسلام کی مخالفت اور اس کے خلاف لوگوں کو مشتعل کرتا رہا۔ میں نے اپنے تیار کردہ اسلام مخالف مواد کو تلف کردیا ہے اور اب اسلام کی حمایت میں ایک کتاب لکھوں گا جس میں ان اعتراضات کا مسکت جواب ہوگا جو اسلام پر کیے جاتے ہیں۔ میں اسلام کے خلاف جو کچھ بولتا یا لکھتا رہا وہ دراصل اس پارٹی کی پالیسی ہے جس سے میں وابستہ تھا اور جو دنیا میں ہونے والے ہر غلط کام کو اسلام کی جانب منسوب کرکے اس کو خوب مشتہر کرتی ہے۔ میرا تعلق ایک مصلح پروٹیسٹنٹ خاندان سے ہے۔ میں نے اسلام کو جذباتی طور پر نہیں بلکہ بہت سوچ سمجھ کر خالصتاً مذہبی بنیادوں پر گلے لگایا ہے۔ ڈچ اخبار این آرسی کے مطابق انہوں نے گزشتہ برس ۲۶/اکتوبر ۲۰۱۸ء کو باقاعدہ اسلام قبول کیا اور جلد ہی ”مرتد: لادین دہشت گردی کے زمانے میں مسیحیت سے اسلام تک“ کے عنوان سے ان کی ایک کتاب منظر عام پر آنے والی ہے۔ معاندین اسلام کے قبول اسلام کا یہ واقعہ انوکھا یا نیا نہیں ہے اسلام کی اب تک کی تاریخ اس قسم کے واقعات سے بھری پڑی ہے کہ لوگوں نے اسلام کی بڑی پرزور مخالفت کی لیکن قرآن کی کشش اور اسلام کے دین فطرت ہونے نے ان کو اپنی اصل پر لوٹا

ہی دیا''۔ (منصف، حیدرآباد ۹؍فروری ۲۰۱۹ء، ص ۸، اداریہ دعوت سہ روزہ، دہلی ۱۳؍فروری ۲۰۱۹ء)

''ہندوستان میں آن لائن ویڈیو مواد سے متعلق ایک چشم کشا رپورٹ''

سال رواں کے شروع میں اخبار مشرق، نئی دہلی نے اپنے اداریہ میں ہندوستان میں آن لائن ویڈیو مواد دیکھنے کے متعلق چشم کشا رپورٹ شائع کی کہ دنیا بھر میں آن لائن ویڈیو مواد دیکھنے والوں میں سب سے بڑی تعداد ہندوستانیوں کی ہے۔ ہندوستانی ہر ہفتہ اوسطاً ۸ گھنٹے ۲۸ منٹ آن لائن ویڈیو دیکھتے ہیں جو ہر ہفتہ ٹی وی دیکھنے والے وقت سے ۲۰ منٹ زیادہ ہے، جبکہ دنیا بھر میں اوسطاً لوگ ۶ گھنٹے ۴۵ منٹ ہی آن لائن ویڈیو دیکھتے ہیں۔ سروے کے مطابق ہندوستانی عوام زیادہ تر فلمیں اس کے بعد بڑی تعداد نیوز دیکھتی ہے۔ فلپائن کے عوام ہر ہفتہ ۸ گھنٹے ۴۶ منٹ اور امریکی عوام ۸ گھنٹے ۳۰ منٹ، جبکہ جرمنی کے عوام ۵ گھنٹے ۲ منٹ سب سے کم آن لائن ویڈیو دیکھتے ہیں۔ فرانس، جرمنی، اٹلی اور برطانیہ میں عوام زیادہ تر کمپیوٹر اور ہندوستان، فلپائن، سنگاپور اور ساؤتھ کوریا میں زیادہ تر یہ نظارے اسمارٹ فونس پر دیکھے جاتے ہیں۔ مذکورہ ممالک میں ۱۸ سے ۳۵ برس کی عمر کے افراد کا سروے کیا گیا تھا۔ گذشتہ سال جون اور اگست کے دوران ہندوستان میں ۲۰ ہزار بچوں کے سروے میں یہ بات معلوم ہوئی کہ یہاں زیادہ تر بچے فلمیں اور ٹی وی شوز دیکھنے میں دلچسپی رکھتے ہیں، سوشل میڈیا پوسٹ کی جانب ان کا رجحان کسی قدر کم ہے۔ رپورٹ کی یہ بات خاص طور پر قابل توجہ ہے کہ مردوں سے زیادہ خواتین انٹرنیٹ استعمال کر رہی ہیں۔ (اداریہ اخبار مشرق، نئی دہلی، ۲؍جنوری ۲۰۱۹ء، ص ۷)

''کیمیائی سائنس میں ابھرتے رجحانات کے موضوع پر کانفرنس''

شعبۂ کیمسٹری، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا اہم شعبہ ہے۔ اس کے زیر اہتمام مذکورہ موضوع پر پچھلے دنوں کانفرنس منعقد ہوئی۔ اس موقع پر افتتاحی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے اے ایم یو کے وائس چانسلر نے کہا کہ اس شعبہ سے متعدد نمایاں اساتذہ اور محققین وابستہ رہے ہیں جنھوں نے اپنی سائنسی خدمات کے سبب ملک اور اے ایم یو کا سر فخر سے اونچا کیا ہے۔ یہ شعبہ امریکہ، برطانیہ، فرانس اور اٹلی کے ممتاز اداروں سے اشتراک کر کے سائنسی میدانوں میں بہت عمدہ کام کر رہا ہے۔ کیمسٹری،

فزکس، بایوکیمسٹری میں تحقیق واختراع کو کلیدی اہمیت حاصل ہے۔ ایکو کارڈیوگرافی، کمپلیٹ بلڈ کاؤنٹ (سی بی سی) کلونو اسکوپی، پروتھرومین ٹائم (پی ٹی)، بون ڈیسٹی اسٹڈی، ایم آر آئی جیسے ٹسٹ بنیادی سائنسز میں تحقیق کا ہی نتیجہ ہیں۔ پرووائس چانسلر نے اپنی گفتگو میں کیمسٹری اور کیمیکل انڈسٹری کو مستحکم کرنے اور پائیدار ترقی دینے کے لیے ماحول دوست بنائے جانے پر زور دیا، اے ایم یو کے تعلیم یافتہ سی سی ایس ہریانہ ایگری کلچر یونیورسٹی کے وائس چانسلر کے پی سنگھ نے کہا کہ وہ آج جو کچھ ہیں وہ اے ایم یو کی بدولت ہیں اور سائنسی علوم وفنون کی خدمات کی انجام دہی میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا کوئی ثانی نہیں ہے۔ (راشٹریہ سہارا، ص۹، ۲۵؍فروری ۲۰۱۹ء)

''ایک نئی ٹیکنالوجی ''کمپیوٹیشنل پیرااسکوپی''

ہفت روزہ سائنسی جریدہ ''نیچر'' میں شائع شدہ تحقیق میں کہا گیا ہے کہ امریکی ماہرین نے خود سے چلنے والی گاڑیوں اور فوجیوں کے لیے ایک ایسی ٹیکنالوجی تیار کر لی ہے جس کے ذریعہ دیواروں کی اوٹ میں اوجھل شئی دیکھی جاسکتی ہے۔ انہوں نے ایک ایسا الگورتھم (سافٹ ویئر) بنایا ہے جو کسی پوشیدہ شی سے ٹکرا کر بکھرنے والی روشنی کو بڑھا کر اسے دیکھنے میں مدد دیتا ہے۔ روشنی کسی بھی شی سے ٹکرا کر منعکس ہوتی ہے لیکن اسے ہر بار دیکھا نہیں جاسکتا۔ تاہم اس کا ایک جزوی سایہ ''پین امبرا'' ضرور بنتا ہے اور جوں ہی یہ کسی شی سے ٹکراتا ہے تو اس شئے کی کچھ تفصیل ضرور دکھاتا ہے جو کیمرے کو نظر آجاتا ہے جسے الگورتھم بڑھا کر اس میں مزید روشنی کا اضافہ کر کے وہ شی یا کم از کم اس کے خدوخال کو ظاہر کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ ماہرین نے اس عمل کو ''کمپیوٹیشنل پیرااسکوپی'' کا نام دیا ہے۔ اس ٹیکنالوجی کے ذریعہ دیوار کے پار لکھے ہوئے الفاظ بھی پڑھے گئے ہیں اور وہاں موجود افراد کے چہروں کے دھندلے ہیولے بھی دکھائی دیے ہیں۔ اس تحقیق سے وابستہ وویک گوئل کا کہنا ہے کہ یہ ایک سستی اور آسان ٹیکنالوجی ہے جو چھپی اشیا، خطرات اور ماحول سے آگاہ کرسکتی ہے۔ اس سے کارخانوں، ایٹمی، بجلی گھروں اور دیگر صنعتی پلانٹس کی مرمت کا کام بھی لیا جاسکتا ہے۔ (انقلاب وارانسی، ۳۰؍جنوری ۲۰۱۹ء، ص ۱۱)

ک۔ص اصلاحی

باب التقریظ والانتقاد

چند علمی تحفے

کچھ عرصہ پہلے بنگلہ دیش سے کتابوں کا ایک تحفہ ملا، خیال تھا کہ بنگلہ زبان کے بعض رسائل کی طرح یہ تحفہ بھی بنگالی زبان کی مطبوعات کا ہوگا۔ مگر سب سے پہلے نظر جن تین ضخیم کتابوں پر پڑی اس سے نظر ہی روشن نہیں ہوئی، دل بھی شاد ہوگیا، الطریق الی تفسیر القرآن الکریم کے نام سے قرآن مجید کی مکمل تشریح وتفسیر عربی زبان میں اور وہ بھی نہایت فصیح وسلیس اسلوب میں، مطالب کہیں سے جمہور علماء کے فکر ونظر سے جدا یا مختلف نہیں، یہ تفسیر کیا کم خوش گوار ومسرت خیز تھی کہ الطریق الی القرآن الکریم کے نام سے چار جلدوں پر مشتمل ایک اور قرآنی تحفہ، یہ بنگالی زبان والوں کے لیے قرآن مجید کے معانی ومطالب کی راہ آسان کرنے کی کاوش اور نہایت مبارک کاوش، ایک ایک لفظ کی تشریح، جس محنت اور دیدہ ریزی سے کی گئی، اس کی اصل قدر تو بنگالی سمجھنے والوں ہی کو ہوگی، ہم تو صفحہ انتساب دیکھتے رہ گئے جو الاھداء کی سرخی لیے ہوئے ہے، انداز دیکھیے:

"الی من احببته من بعید .... الی من سعیت ان اتبع خطاه .... الی من تمنیت ان یکون قلمی کقلمه .... الی من علمنی کیف اتفکر و کیف استفید، کیف اتزود وکیف اتسلح وکیف اجاھد ضد طغاة العلم وطواغیت القلم .... الی فقید الامة الاسلامیة السید ابی الحسن علی الحسنی الندوی التشرف باھداء ھذا الکتاب"۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے لیے محبت، آرزو، کشش اور استفادہ کے یہ الفاظ نہیں، جذبات کی ایسی دلکش لہریں ہیں جو خلیج بنگال اور بحیرہ عرب کے فرق کو بھلا دیتی ہیں۔ تحفہ کیا تھا، ایک دفتر کھل گیا یا ایک چمن آراستہ وپیراستہ نظروں کو مہکا گیا۔

قرآن کریم کی عربی وبنگالی تفسیر کے بعد الطریق الی الفقہ، الطریق الی البلاغۃ، الطریق الی

الصرف، الطریق الی النحو جیسی کتابیں اور قصص النبیین للاطفال بھی بنگلہ ترجمے کے ساتھ، مولانا شفیق الرحمٰن ندوی مرحوم کی مشہور درسی کتاب الفقہ المیسر بھی تیسیر الفقہ المیسر کے نام سے نئے قالب میں۔

حیرت اور سوا اس وقت ہوئی جب ہر کتاب پر ایک ہی نام ابوطاہر بن مصباح روشن نظر آیا، تعارفی کلمات ہر کتاب میں اگر ہوں گے بھی تو بنگلہ میں، شاید اسی مشکل کو آسان بنانے کے لیے عزیز گرامی مفتی مولانا محمد یونس سلمہ اللہ نے ایک تعارفی تحریر بھیج دی، آں عزیز نے ہندوستان میں دینی وعربی تعلیم حاصل کی، اس وقت وہ حیدرآباد کے المعہد العالی میں مولانا خالد سیف اللہ رحمانی کے سایہ تربیت میں ہیں۔ دارالمصنّفین سے ان کو والہانہ تعلق ہے، اعظم گڑھ کے مدرسہ بیت العلوم پھول پور میں حصول تعلیم کے دوران وہ برابر دارالمصنّفین آتے رہے، ان کی تحریر سے معلوم ہوا کہ مولانا ابوطاہر بن مصباح نے چاٹگام کی جامعہ اسلامیہ میں تعلیم حاصل کی، بنگلہ دیش میں عربی زبان کو بنگلہ زبان کے ذریعہ سمجھنے اور پھر قرآن وعربی علوم کو فروغ دینے میں انہوں نے اپنی تمام صلاحیتیں وقف کردیں۔ جو کتابیں ہمارے پیش نظر ہیں ان کے علاوہ ان کا ایک بڑا کارنامہ عربی بنگلہ قاموس بھی ہے جو المنار کے نام سے ہے۔ مولانا ابوطاہر کو قرآنیات اور عربی زبان وادب کا یہ شوق بلکہ جنون مولانا سلطان ذوق ندوی کی تربیت اور حوصلہ افزائی سے ملا۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ مولانا ابوطاہر نے بچوں کے لیے عربی میں ''اقرا'' نام کا رسالہ بھی نکالا جو غالباً برصغیر میں اپنی نوعیت کا پہلا رسالہ ہے، بنگلہ دیش کے قیام کے بعد انہوں نے محسوس کیا کہ اب شاید وہ سابقہ نظام تعلیم خصوصاً دینی تعلیم کا مروجہ منہج باقی نہیں رہ پائے گا یعنی اردو زبان، دینیات کی تعلیم کا ذریعہ نہیں رہے گی، ان کی اس فکر نے جب مثبت طریقہ کی تلاش کی تو نتیجہ سامنے آگیا کہ بنگلہ زبان میں قرآنی علوم کو ان کے اصل سرچشمہ سے حاصل کرنے کی راہ آسان ہوگئی، یہ ایسا عمل بلکہ کارنامہ ہے جس کی بنا پر مشہور عالم ومحدث جناب مولانا عبدالمالک نے فرمایا کہ ''مولانا ابوطاہر بنگلہ دیش میں اس زمانہ کے مجدد تعلیم وتربیت ہیں''۔ انہوں نے بنگلہ دیش میں جب مدرسۃ المدینہ کی بنیاد ڈالی تو بس یہی کہا کہ ''اصل میں اللہ کی طرف سے ملے ہوئے کچھ افکار اور مقاصد کو وجود میں لانے کی یہ کوشش ہے''۔ اس مدرسہ کے نصاب کو انہوں نے درس نظامی کی روح اور جذبہ کارہین بتایا کہ چند تغیرات کی موجودگی سے ''مدنی نصاب'' کا مقصد تغیر پذیر حالات کی محتاط رعایت ہے، اس نصاب کے پانچ مراحل

سے اندازہ ہوتا ہے کہ دیوبند اور ندوہ دونوں کی جامعیت بھی ان کے پیش نظر رہی۔ قرآنیات کے اہتمام سے مدرسۃ الاصلاح سے استفادہ کا اشارہ ملتا ہے۔ درسیات میں ایک کتاب الطریق الی الاردیۃ کا نام دیکھ کر قدرتاً خوشی میں اضافہ ہوا، حکمت کس درجہ ملحوظ ہے، اس کا اندازہ یوں ہوتا ہے کہ اس کتاب میں شروع میں ایسے الفاظ زیادہ لائے گئے جو بنگلہ زبان میں اسی معنی میں مستعمل ہیں، بنگلہ میں چونکہ اردو حروف کے متشابہ حروف موجود ہیں اس لیے اردو کے ہر حرف کے ساتھ بنگلہ میں اس کا مشابہ حرف دیا گیا، ایسی صورت میں اس حرف کا تلفظ بنگلہ کی طرح کرنے کو زیادہ مناسب سمجھا گیا۔

اس طرح یہ مدنی نصاب صرف بنگلہ دیش ہی کے لیے نہیں، برصغیر کے اور مدارس کے لیے بھی لائق غور وفکر اور بڑی حد تک لائق عمل بن سکتا ہے۔ مولانا ابوطاہر کے متعلق لکھا گیا کہ انہوں نے چھوٹے سے کمرہ میں رہ کر زندگی ایک عظیم مقصد کے لیے صرف کردی، کسی کانفرنس میں کوئی تقریر نہیں کی بلکہ یہی کہا کہ "آج بولنے سے زیادہ کام کی ضرورت ہے"۔ ان جملوں سے حضرت مولانا سید سلیمان ندوی کی وہ بات یاد آ گئی جو انہوں نے اتفاق سے غیر منقسم ہندوستان کے بنگال میں انجمن علمائے بنگالہ کے صدر کی حیثیت سے فرمائی تھی کہ "بنگال میں پانچ برس سے یہ انجمن اشاعت وحفاظت اسلام کا مفید کام انجام دے رہی ہے، پانچ برس کے عرصہ میں اگر اس سے کوئی غلطی ہوئی تو یہی کہ اس نے بھی عام انجمنوں کی طرح اپنا سالانہ اجلاس کیا، ہم نے انجمن کے کارکنوں سے عرض کردیا ہے کہ اگر وہ کام کرنا چاہتے ہیں تو اپنی انجمن کو سالانہ جلسہ کرنے والی مجلس نہ بنائیں، پھر علمائے کرام کی مجلس، اگر ایک دو اجلاس اور ہوئے تو ٹوٹ پھوٹ کر رہ جائے گی، خاموشی سے کام کرو اور سال میں اپنے اعمال کا تحریری جائزہ دو اور بس"۔

معارف میں بنگال کے تعلق سے کچھ نہ کچھ ہمیشہ لکھا جاتا رہا، بنگلہ دیش بننے کے بعد ذکر و فکر کا یہ شغل کچھ تھم سا گیا، اب جو یہ مفید اور قابل قدر تحریری خدمات سامنے آئیں تو کیا بتائیں کہ

دل کو کیا جانیے کیا یاد آیا

ع۔ص

آثار علمیہ و تاریخیہ

ریویو موازنہ انیس و دبیر
از
مولوی سید وحید الدین سلیم

اشتیاق احمد ظلی

موازنہ انیس و دبیر علامہ شبلی کی شہرۂ آفاق تصنیفات میں شامل ہے۔ موافقت اور مخالفت دونوں پہلوؤں سے اس پر جتنا لکھا گیا علامہ کی کم کتابوں پر اتنا لکھا گیا ہوگا۔ یہ کتاب ۱۹۰۷ء میں مفید عام پریس، آگرہ سے شائع ہوئی۔ اب تک کی دستیاب معلومات کے پیش نظر اس پر سب سے پہلا تبصرہ ماہنامہ عصر جدید، لکھنؤ میں شائع ہوا جو خواجہ غلام الثقلین کی ادارت میں نکلتا تھا۔ تبصرہ نگار سید امجد علی اشہری تھے۔ اس کا عنوان تھا ''موازنہ انیس و دبیر پر اجمالی ریویو''۔ یہ ریویو جولائی ۱۹۰۷ء میں شائع ہوا(۱)۔ اسی مہینہ میں ایک اور ریویو علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں شائع ہوا تھا لیکن ابھی تک یہ وقت کی گرد کے نیچے دبا رہا۔ ابھی گذشتہ دنوں اس کا انکشاف ہوا۔ یہ بات باعث حیرت ہے کہ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ جیسے معروف اخبار میں شائع ہونے کے باوجود اس کا کہیں کوئی ذکر نہیں ملتا۔ گزٹ کے ۲۶؍ جون کے شمارے میں یہ خبر درج ہے کہ ''موازنہ انیس و دبیر مصنفہ شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی آج کل ہمارے مطالعہ میں ہے۔ قریب کی کسی اشاعت میں اس نادر کتاب پر ریویو لکھا جائے گا''۔ چنانچہ ۱۰؍ جولائی کے شمارے میں یہ ریویو شائع ہوا۔

تبصرہ نگار کا نام کہیں درج نہیں ہے۔ اس سے واضح ہے کہ یہ ایڈیٹر کے قلم سے ہے۔ سرسید کے انتقال کے بعد جب فروری ۱۹۰۱ء میں گزٹ کا دوبارہ اجرا ہوا تو اس کی پیشانی پر ایڈیٹر کی حیثیت سے دو نام درج ہوتے تھے؛ فرسٹ ایڈیٹر محسن الملک اور سیکنڈ ایڈیٹر مولوی سید وحید الدین سلیم لیکن عملاً ادارت کا کام مولوی سید وحید الدین سلیم ہی انجام دیتے تھے۔ یوں بھی اس وقت محسن الملک بیماری کی

وجہ سے بمبئی میں مقیم تھے(۲)۔اس لیے یہ نتیجہ نکالنا دور از کار نہیں ہوگا کہ یہ ریویو مولوی سید وحیدالدین سلیم کا رشحہ قلم ہے۔اس کا انداز تحریر بھی اسی بات کی غمازی کرر ہا ہے۔علامہ شبلی سے ان کے تعلقات میں جو دھوپ چھاؤں کی کیفیت رہی ہے وہ اس سے بھی ظاہر ہے۔ریویو میں حیات جاوید پر علامہ شبلی کے تبصرہ کی بازگشت صاف سنائی دیتی ہے۔بہر حال اس کی تاریخی اور ادبی حیثیت مسلم ہے اور اسی اہمیت کے پیش نظر اسے کسی تبصرہ کے بغیر ہدیہ ناظرین کیا جاتا ہے۔

ریویو موازنہ انیس ودبیر

اس نام کی ایک نادر کتاب جو شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی کی تصنیف ہے، حال میں شائع ہوئی ہے۔ یہ کتاب ۲۹۴ صفحے کی ہے اور برخلاف مولانا کی دیگر تصنیفات کے یہ فلس کیپ سائز پر چھاپی گئی ہے۔اس کی قیمت دو روپیہ آٹھ آنے ہے۔

فاضل مصنف نے اس کتاب میں انیس کی شاعری پر ریویو کیا ہے اور دبیر کی شاعری سے اس کا مقابلہ کر کے ثابت کیا ہے کہ دبیر کی شاعری کو انیس کی شاعری سے کوئی نسبت نہیں ہے۔

دبیر اور انیس کا تذکرہ سب سے پہلے مولانا آزاد نے ''آب حیات'' میں لکھا ہے۔انہوں نے دونوں کی شاعری کا فرق تخیل اور استعارہ کے پیرائے میں دکھایا ہے،مگر اس طریقہ سے حقیقت میں نہ کسی شاعر کے کلام کی خوبی ثابت ہوتی ہے اور نہ اس کے عیوب پر لوگوں کو یقین ہوتا ہے۔اس کے بعد مولانا حالی نے اپنے دیوان کے مقدمے میں بطور ایک ضمنی بیان کے انیس کی شاعری پر اس طریقۂ تنقید سے نظر ڈالی ہے جو آج کل یوروپ میں رائج ہے۔حقیقت میں یہی وہ مضمون تھا جس کے پڑھنے کے بعد عام طور سے لوگوں کی نظریں انیس کی طرف اٹھنے لگیں اور لوگ اس کی شاعری کو حد سے زیادہ پسند کرنے لگے۔حیات سعدی میں مولانا حالی نے اس طریقۂ تنقید کو نہایت خوبی سے نبھایا ہے اور سچ یہ ہے کہ ان سے پہلے اردو زبان میں کسی مصنف نے اس میدان میں قدم نہیں رکھا۔

مولانا شبلی کا خاص مضمون تاریخ ہے۔ان کی کوئی تصنیف اس مذاق سے خالی نہیں ہے۔اس کتاب میں بھی سب سے پہلے انہوں نے مرثیہ گوئی کی تاریخ لکھی ہے اور عرب اور ایران کی مرثیہ گوئی کا حال لکھ کر اردو زبان کی مرثیہ گوئی کی اجمالی تاریخ بیان کی ہے۔اس کے بعد انہوں نے فصاحت اور

بلاغت کی حقیقت بتائی ہے اور اس خاص موضوع پر جو کچھ لکھا ہے نہایت شرح و بسط سے لکھا ہے۔ سچ یہ ہے کہ آج سے پہلے ہماری زبان کی کسی کتاب میں یہ مضمون اس صفائی اور سادگی، وضاحت اور صراحت سے نہیں لکھا گیا۔ مولانا شبلی جب کسی علمی مضمون پر قلم اٹھانا چاہتے ہیں، تو وہ اس کے لیے کوئی ایسا دلچسپ پیرایہ بیان اختیار کرتے ہیں، جس سے عام لوگوں کے مذاق بہت مانوس ہوتے ہیں۔ فصاحت اور بلاغت کی حقیقت بتانے کے لیے انیس کی شاعری سے بہتر کوئی پیرایہ نہیں تھا؛ اس لیے انہوں نے اپنی معلومات کو بے تکلف اس سانچے میں ڈھال دیا۔ وہ کبھی ایسے گہری علمی باتیں بیان نہیں کرتے جو مذاق عام کی نظر میں روکھی پھیکی اور بے مزہ معلوم ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی ہر تصنیف کو حسن قبول نصیب ہوتا ہے۔

مولانا نے اول نہایت خوبی سے فصاحت و بلاغت کے اصول بیان کیے ہیں۔ پھر انیس کے کلام سے متعدد مثالیں ہر اصول کے ذیل میں درج کی ہیں؛ مگر ہماری رائے میں وہ مجمل بیان کافی نہیں ہے، جو کسی اصول کی تشریح کے لیے درج کیا گیا ہے۔ بہتر یہ تھا کہ جو مثالیں ہر اصول کے ذیل میں لکھی گئی ہیں، ان پر اصول کی مطابقت تفصیل کے ساتھ کی جاتی؛ کیونکہ شاعری فنون لطیفہ میں شمار ہوتی ہے اور اس کا حسن و قبح ہر شخص کو یکساں اور یقینی طور پر محسوس نہیں ہوتا۔ بلاشبہہ اس طریقہ سے بہت کم مثالیں کتاب میں درج ہوسکتی تھیں، مگر عام لوگوں کے ذہن میں انیس کی شاعری کی خوبیاں اچھی طرح منقوش ہوجاتیں۔ کتاب کے بیسیوں اوراق انیس کے اشعار سے، جن کے ساتھ نہ کوئی نوٹ ہے اور نہ ان کی خوبیوں کی تشریح کی گئی ہے، بھرنے کی ضرورت نہیں تھی؛ کیونکہ انیس کا کلیات ہر جگہ ملتا ہے اور ہر شخص آسانی سے اس کا مطالعہ کرسکتا ہے۔

مولانا نے اس کتاب میں نہایت عمدگی سے اس امر کو ثابت کردکھایا ہے کہ انیس ایک فطرت نگار شاعر تھا اور اس کے ثبوت کے لیے انہوں نے جذبات، مناظر فطرت، منظر یا سین اور واقعہ نگاری کے مختلف عنوان قائم کیے ہیں۔ ہماری رائے میں سب سے آسان طریقہ یہ تھا کہ صرف بیرونی فطرت اور اندرونی فطرت کے عنوان قائم کیے جاتے اور ہر ایک کی مثالیں انیس کی شاعری سے دی جاتیں۔ اس تقسیم کے ذیل میں تمام مذکورہ بالا عنوان آجاتے ہیں۔ مثلاً ایک جگہ واقعہ نگاری کے بیان میں مولانا نے لکھا ہے کہ ''اس کے لیے صرف قدرت زبان کافی نہیں؛ بلکہ فطرت کا بڑا نکتہ داں ہونا ضروری ہے''۔ اس

بیان سے صاف ظاہر ہے کہ واقعہ نگاری درحقیقت فطرت نگاری کے ذیل میں داخل ہے، علاحدہ کوئی چیز نہیں ہے۔ رزمیہ اور گھوڑے کا بیان اور تلوار کا بیان بھی ایسے عنوان نہیں ہیں، جو اس قسم سے خارج ہوں۔ ایک جگہ فاضل مصنف نے بیان کیا ہے کہ فردوسی نے رزم نگاری کے لیے اور انیس نے مرثیہ گوئی کے لیے خاص بحریں اختیار کی ہیں۔ اگر وہ ان خاص بحروں سے گریز کرتے، تو ان کو حسن قبول حاصل نہیں ہوسکتا تھا؛ کیونکہ یہ بحریں ان مضامین کے لیے خاص طور سے موزوں اور مناسب ہیں۔ یہ امر بلاشبہہ نہایت صحیح ہے، مگر افسوس ہے کہ مولانا نے اس نکتہ کی کوئی معقول وجہ بیان نہیں کی۔ اسی طرح انھوں نے ایک جگہ لکھا ہے کہ رباعیوں کی بحریں اخلاقی اور صوفیانہ مضامین کے لیے موزوں ہیں۔ یہ بھی کسی قدر سچ ہے، مگر وہ اس کی بھی کوئی وجہ بیان نہیں کرسکے۔

کتاب کے آخر میں مولانا نے دبیر کے کلام کی کمزوریاں دکھائی ہیں اور ثابت کیا ہے کہ انیس کی شاعری کے مقابلہ میں اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔

بعض لوگوں نے انیس کے اشعار پر جو لفظی نکتہ چینیاں کی ہیں، ان میں سے بہت سے اعتراضات بھی مولانا نے اس کتاب میں درج کیے ہیں۔ پھر ان میں سے بعض کو تسلیم کیا ہے اور اکثر کو رد کردیا ہے۔ کیا مولانا کو معلوم نہ تھا کہ اس قسم کے اعتراضات زمانہ حال کے اصول تنقید کے لحاظ سے بے حقیقت ہیں، ان اعتراضات کو نقل کرنے کی ظاہری وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ خود مولانا نے لکھا ہے ''ہماری رائے ہے کہ جس وسعت اور تفصیل کے ساتھ میر انیس کی خوبیاں ظاہر کی گئی ہیں، اسی طرح نہایت آزادی اور بے باکی سے ان کی فروگذاشتیں اور غلطیاں بھی ظاہر کی جائیں''۔ مگر ہم کو افسوس ہے کہ جس آزادی اور بے باکی کے ساتھ انھوں نے اس امر کا بیڑا اٹھایا ہے، اس کے فرض سے وہ کماحقہٗ سبک دوش نہ ہوسکے۔

مولانا اس فرض سے سبک دوش ہوئے ہیں، یا نہ ہوئے ہیں، اصلی وجہ اس کوشش اور سرگرمی کی یہ ہے کہ انھوں نے اس کتاب میں بھی اور اپنے بعض دیگر مضامین میں بھی اس بات کا اشارہ کیا ہے کہ بعض بہتر سے بہتر سوانح عمریاں جو ہمارے ملک میں لکھی گئی ہیں؛ وہ آزادانہ نکتہ چینی سے خالی ہیں اور ان میں ہیرو کی خوبیوں کے سوا اس کے عیوب بالکل نہیں دکھائے گئے ہیں اور اس نقص کی وجہ سے وہ شاعرانہ قصائد سے بہت مشابہ ہیں۔ مگر سوانح عمریوں کا یہ نقص جو مولانا نے بیان کیا ہے، اس

سے ہمارے ملک کے کسی مصنف کی لکھی ہوئی سوانح عمری خالی نہیں ہے اور اس معیار پر بلا استثنا ہمارے ملک کا کوئی مصنف آج تک پورا نہیں اترا۔ اگر یہ شخص پرستی کا ایشیائی میلان ہے، جیسا کہ خود مولانا کا قول ہے، تو ہم کو مجبوراً یہ لکھنا پڑتا ہے کہ ہماری قوم کے تمام مصنف کم وبیش اس گناہ کے مرتکب ہوتے ہیں۔

اس چند سرسری باتوں کے سوا، جن میں ہم کو مولانا سے دوستانہ اختلاف ہے، ہماری نظر میں ان کی کتاب اپنے مضمون اور طرز ادا کے لحاظ سے بے مثل ہے اور آج سے پہلے کوئی کتاب انیس کی شاعری کی خوبیوں پر اور پھر اس تفصیل اور وضاحت اور ایسے دلچسپ اور دلفریب انداز میں نہیں لکھی گئی۔ ہم کو امید ہے کہ انیس ودبیر کی شاعری، جس کا خیالی موازنہ لوگ آج تک اپنے اپنے خاص مذاق کی بنا پر کرتے رہے ہیں، اس کتاب کے شائع ہونے کے بعد اصلی اور صحیح اور مدلل اور معقول طریقہ سے اس کے حسن وقبح کا فیصلہ ہوجائے گا۔

اگر آج انیس حسن اتفاق سے زندہ ہوجائے اور دیکھے کہ اس کی حمایت میں اس ملک کے بڑے بڑے روشن خیال مصنّفین نے کمر باندھی ہے اور اس کی شاعری کی خوبیاں وہ اہل ملک سے بزور منوانے کے لیے تلے ہیں تو وہ یقیناً دنگ رہ جائے اور اپنے زمانے کی ناقدریوں کو یاد کرکے بول اٹھے کہ اے کاش! میں اس زمانے میں پیدا ہوتا اور مجھ کو یہ شعر نہ کہنا پڑتا:

کس وقت میں ہم چھوڑ کے ملک عدم آئے
جب اٹھ گئے بازار سے گاہک، تو ہم آئے

(گزٹ ۱۰/ جولائی ۱۹۰۷ء، ص ۳۔۴)

حواشی

(۱) مشمولہ ظفر احمد صدیقی، شبلی شناسی کے اولین نقوش، دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ۲۰۱۶ء، ص ۲۶۲۔۲۷۰۔ (۲) علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، علی گڑھ، ۱۲/ جون اور ۱۷/ جولائی ۱۹۰۷ء۔

مکتوب شیخ عنایت اللہ
بنام
مولانا سید ریاست علی ندوی مرحوم

کلیم صفات اصلاحی

مولانا سید ریاست علی ندوی مرحوم، علامہ سید سلیمان ندوی کے خصوصی تربیت یافتہ اور ان کے ہم وطن تھے۔ ۱۹۲۴ء میں سید صاحب کے ایما پر دارالمصنّفین سے بحیثیت رفیق وابستہ ہوئے اور اس کے علمی و تحقیقی منصوبوں کی تکمیل کا ناقابل فراموش حصہ بن گئے۔ دارالمصنّفین کے سلسلۂ تاریخ اسلام کو دو حصوں مشرقی اور مغربی ممالک میں تقسیم کیا گیا تھا۔ موخرالذکر یعنی مغربی دنیا کے اسلامی ملکوں اور سلطنتوں کی تاریخ لکھنے کی خدمت مولانا سید ریاست علی ندوی مرحوم کو سپرد کی گئی۔ اس وقت تک اردو میں اس موضوع پر کوئی مفصل و مستند کتاب نہیں تھی۔ چنانچہ اس منصوبے کے تحت ''تاریخ صقلیہ'' کی دو جلدیں مولانا ندوی کے قلم سے منظر عام پر آئیں اور علمی حلقوں میں ان کی خوب پذیرائی ہوئی۔

اس کے بعد مولانا نے تاریخ اندلس پر توجہ کی۔ ان کے خاکہ کے مطابق اس کو پانچ جلدوں پر مشتمل ہونا تھا۔ پہلی جلد مرتب کر کے معارف پریس کے حوالے کر چکے تھے کہ صوبہ بہار کے شعبہ تعلیم سے وابستہ ہو کر پٹنہ چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد ۱۹۵۰ء میں یہ پہلی جلد شائع ہوئی۔ یہ کہانی خود مولانا کی زبانی اس طرح ہے:

> ''راقم سطور نے سسلی کی تاریخ کی ترتیب دو جلدوں رزمیہ و بزمیہ حیثیت سے رکھی تھی، لیکن اندلس کی تاریخ کی ترتیب دوسرے انداز پر رکھی گئی ہے۔ اس میں ہر حکمراں کے دور کے سیاسی حالات کے خاتمہ کے بعد اس عہد کے نظامت حکومت، علوم و فنون، تعمیرات، دوسری تمدنی و معاشرتی ترقیوں کا اجمالی جائزہ بھی لیا گیا ہے۔ اس طرح رزم و بزم کی داستان ایک ساتھ تیار ہوتی چلی گئی ہے۔ ارادہ تھا کہ ان جلدوں کے خاتمہ کے بعد ایک جلد ''رجال اندلس'' کے لیے وقف ہوگی جو اس سلسلہ کی پانچویں کڑی ہوتی۔ اس کا مواد بہت کچھ اکٹھا کر لیا گیا

تھا، مختلف تعلیقات بھی قلم بند کیے گئے تھے لیکن افسوس ہے کہ اس کو ترتیب دینے کا موقع ہاتھ نہ آسکا اور راقم سطور صوبہ بہار کے شعبہ تعلیم سے وابستہ ہو کر پٹنہ چلا آیا اور یہاں اپنے فرائض مفوضہ میں مصروف ہے۔ اگر زمانہ نے مساعدت کی تو شاید کبھی اس خدمت کے انجام دینے کا موقع ہاتھ آسکے''۔(دیباچہ تاریخ اندلس، حصہ اول، ص ۴)

بہر حال اس کی بقیہ جلدیں بھی مولانا نے مکمل کر لی تھی۔ اس کے مسودات ان کے اثاثہ بیت میں محفوظ تھے، لیکن طباعت سے محروم۔ پروفیسر اشتیاق احمد ظلی صاحب کو ان کا خیال آیا تو ان کی مسلسل مساعی سے یہ خزینہ مولانا کے فرزند ارجمند جناب سید اشہد علی ایڈوکیٹ کی عنایت سے ادارے کو دستیاب ہو گیا۔ سید اشہد صاحب نے نہ صرف اس قیمتی علمی ورثہ کی حفاظت کی بلکہ چار صفحات پر مشتمل ایک جامع فہرست ''فہرست مسودات مولانا سید ریاست علی ندوی صاحب مرحوم مملوکہ سید اشہد علی صاحب ایڈوکیٹ، آبگلہ۔ گیا'' کے نام سے تیار کر دی جس سے بقیہ مسودات کی نوعیت کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے۔ اس فہرست کے صفحہ تین پر ''تاریخ اندلس جلد سوم اور چہارم مکمل'' درج ہے۔ لیکن دوسرے حصہ کے مسودے کا ذکر نہیں ہے۔ دراصل مولانا کے انتقال کے وقت دوسرا حصہ پریس کے لیے تیار تھا اور انہوں نے اسے دارالمصنّفین بھیجنے کی تاکید کی تھی۔ بدقسمتی سے وہ مبیضہ دارالمصنّفین نہیں پہنچ سکا اور اب اس کا کوئی سراغ نہیں مل رہا ہے۔ جو مواد اب اکیڈمی کو مل گیا ہے اس کی اشاعت کا اہتمام کیا جارہا ہے۔ انشاءاللہ جلد ہی یہ بیش قیمت تاریخ، زیور طبع سے آراستہ ہوگی۔

سید اشہد علی صاحب نے مولانا ندوی کے نام ہندوستان کے تقریباً پچاس نامور اصحاب علم و فضل کے مکتوبات کی ایک فہرست ''مشاہیر کے خطوط بنام مولانا سید ریاست علی ندوی'' کے عنوان سے تیار کی ہے مگر زیر نظر خط اس فہرست میں نہیں ہے۔

یہ خط ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ مرحوم نے مولانا ندوی کو تاریخ صقلیہ کے متعلق تحریر کیا ہے۔ اس میں تاریخ صقلیہ پر انگریزی میں تبصرہ اور جلد اول میں کچھ مقامات پر بعض لفظی تغیر کی تجویز ہے۔ اسی اہمیت کے سبب یہ خط قارئین معارف کی خدمت میں پیش کیا جارہا ہے۔

ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ گورنمنٹ کالج ملتان (پنجاب) میں پروفیسر تھے، مولانا ندوی مرحوم کے دوست تھے۔ اسلامی ممالک کی تاریخ پر ان کی خاص نظر اور سیرت سے ان کو دلچسپی تھی۔ سیرت کے

موضوع پر جلسوں میں تقریریں بھی کرتے تھے جن کو مولانا اپنے رسالہ ندیم (گیا) میں شائع بھی کرتے رہتے تھے۔ شیخ صاحب رسالہ "اسلامک کلچر" (حیدرآباد) میں انگریزی اور اردو کتابوں پر تبصرے کرتے تھے۔ مولانا ندوی نے تاریخ اندلس جلد اول کے دیباچے میں ان کے علمی تعاون کا شکریہ درج ذیل الفاظ میں ادا کیا ہے:

"کتاب کے مآخذ کی مفصل فہرست انشاءاللہ آخری جلد میں منسلک ہوسکے گی۔ اس سلسلہ میں مجھے اپنے لائق دوست ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ صاحب ایم اے، پی ایچ ڈی پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور کا شکر گذار ہونا ہے کہ ان کی عنایت فرمائی سے ہمیں کیمبرج میڈیول ہسٹری کی جلد سوم پنجاب یونیورسٹی لائبریری سے مستعار حاصل ہوئی جس میں "مغربی خلافت" کے عنوان سے اموی سلاطین اندلس پر ایک قابل قدر باب ہے اور جس سے اس کتاب میں "دولت امویہ اندلس پر ایک نظر" کے باب میں خاص طور پر فائدہ اٹھایا گیا ہے"۔ (ص ۵۔۶، معارف پریس، اعظم گڑھ، ۱۹۵۰ء)

پروفیسر مذکور نے جن مشمولات سے خط میں اختلاف یا جلد اول کی جن جگہوں پر لفظی تغیر کی نشاندہی کی ہے راقم سطور نے اس کا مقارنہ کیا تو پتہ چلا کہ اب تک اس پر نظر ثانی نہیں کی جاسکی ہے۔ مثلاً جلد دوم میں شہر قطانیہ (Catania) کے متعلق جو معلومات مولانا ریاست علی صاحب نے تحریر فرمائی تھیں وہ نزہتہ المشتاق، نشق الازہار فی عجائب الاقطار اور معجم البلدان وغیرہ کے حوالے سے تھی۔ لیکن مکتوب نگار نے امری کی تاریخ "تاریخ مسلمانان صقلیہ" کے دوسرے ایڈیشن کے حوالے سے لکھا ہے کہ یہ شہر اسی نام سے اب تک موجود ہے۔

خط کی نقل

گورنمنٹ کالج ملتان (پنجاب)
۳۱/ مارچ ۳۸ء

سیدی و مولائی دام لطفہٗ

السلام علیکم۔ نوازش نامہ آپ کا مورخہ ۱۲/ جنوری مل گیا تھا۔ افسوس کہ تاحال جواب نامہ اور ارشاد تعمیل سے قاصر رہا۔ اس عریضہ ہے کے ساتھ ایک "تقریر سیرت" بھیج رہا

ہوں۔ جو میں نے یہاں ملتان میں ایک جلسہ میں کی تھی۔ میلاد النبی کا دن ۱۳ رمئی کو آرہا ہے۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو میلاد کی تقریب سے مئی کے پرچہ میں مناسب عنوان کے ساتھ شائع فرمادیں۔ یہ تقریر پہلے کہیں نہیں چھپی۔ اگر کسی وجہ سے آپ کے رسالہ کے مناسب حال نہ ہوتو بلا تکلف واپس بھیج دیں۔ میں کوئی اور مضمون بھیج دوں گا۔

ندیم کے چند ایک پرچے وصول پائے۔ دلی شکریہ قبول کریں۔ اسلامی تعلیم پر آپ کا مضمون معارف میں نظر سے گزر رہا ہے۔ ماشاءاللہ بہت عمدہ اور مفید مقالہ ہے۔ میں اسے بہت دلچسپی سے دیکھ رہا ہوں۔

پچھلے ایام میں بہت مصروفیت رہی۔ اولاً تو کالج کا خاصہ کام تھا۔ الحمدللہ کہ اب کلاسیں امتحان کے لیے چلی گئی ہیں اور اب قدرے فراغت ہے۔ دوسرے لاہور کی چند ایک سوسائٹیوں کے لیے مقالے لکھنے تھے۔ زبان ان کی انگریزی تھی۔ انشاءاللہ اسلامک کلچر (حیدرآباد) کے اپریل نمبر اور بعد کی اشاعتوں میں چھپ جائیں گے اور آپ کے ملاحظہ سے گزریں گے۔ علاوہ ازیں شیخ محمد اسد اڈیٹر رسالہ مذکور نے کچھ کتابیں ریویو کے لیے بھیج دیں۔ وہ ریویو بھی رسالہ کی آئندہ اشاعت میں چھپ جائیں گے۔ جیسا کہ شاید آپ نے ملاحظہ کیا ہوگا کچھ عرصہ سے رسالہ مذکور میں ریویو نگاری کا مشغلہ جاری ہے۔ خیال ہے کہ آپ کی تاریخ صقلیہ کا ریویو بھی وہیں چھپے۔ چنانچہ اسی خیال سے اس کی دوسری جلد دیکھ رہا ہوں۔ جیسا کہ آپ کو یاد ہوگا مسٹر مارماڈیوک پکتھال مرحوم کے وقت میں اسلامک کلچر میں اردو کتابوں پر بھی ریویو چھپا کرتے تھے۔

ایک صفحہ دیگر پر میں نے جلد اول میں چند ایک جگہ معمولی لفظی تغیرات تجویز کیے ہیں۔ بعد تحقیق ان کو نوٹ کرلیں۔

جلد دوم ص ۱۳۱ پر آپ نے شہر قطانیہ (Catania) پر جو کچھ لکھا ہے اس سے یہ مستفاد ہوتا ہے کہ گویا یہ شہر برباد ہوگیا۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے۔ یہ شہر اسی نام سے اب تک موجود ہے چنانچہ اَمَری کی ''تاریخ مسلمانان صقلیہ'' کا دوسرا اڈیشن پروفیسر نالینو کی نگرانی میں اسی شہر کے ایک پبلشر کی طرف سے شائع ہورہا ہے۔ اس قسم کے مختلف شہروں اور اطراف کی موجودہ حالت اور کیفیت معلوم کرنے کے لیے آپ Baedeker's Guide to Southern Italy of Sicily,

with 75 maps of plans. Published by George Allan Unwin, London at 16 sh. کی طرف رجوع کریں۔ یہ کتاب ہے تو گائڈ، مگر بہت مکمل ہے گویا پورا جغرافیہ ہے۔ اکثر مقامات کے تاریخی حالات اور قدیم آثار کا ذکر بھی ہے۔ میرا خیال ہے کہ تاریخ صقلیہ کے سلسلہ میں آپ کے لیے بہت مفید ثابت ہوگی۔ کتاب تھیکر کمپنی کلکتہ سے مل جائے گی۔ ویسے امپیریل لائبریری کلکتہ سے مستعار بھی مل سکتی ہے۔

مارچ کا ندیم ابھی ابھی ملا۔ چھپائی کے معاملہ میں تا حال کافی ترقی اور اصلاح کی گنجائش ہے۔

والسلام

عنایت اللہ

تاریخ صقلیہ جلد اول

ص ۴: اماری کی وفات کی بجائے اَمرِی کی پیدائش پڑھیے

ص ۱۳: ۵۰۰ میل بلند ہے 〃 ۵۰۰ فٹ

ص ۲۱: اہل فنیقہ کو "شتر سوار" کہنا کہاں تک درست ہے؟ وہ تو ایک مدت سے جہاز راں قوم بن چکے تھے۔

ص 〃: زیڈن اور ٹائر کو صور و صیدا لکھیے

ص ۱۳: پلیٹو کو سطح مرتفع لکھیے

ص ۲۶: مسٹر فریمین پروفیسر فریمین

ص ۲۶: Slav (غلام) صقلب

ص ۲۷: ہبرو کی بجائے عبرانی لکھیے

ص ۴۵: اینٹیاک انطاکیہ

ص ۸۵: نن nun راہبہ

ص ۸۳: منجنیق کی اصل یونانی لفظ mangeanon ہے۔

معارف کی ڈاک

فکرونظر کے سال اجرا کے بارے میں ایک غلط فہمی کا ازالہ

۲۹/جنوری ۲۰۱۹ء
بدایوں

مکرمی! سلام مسنون

معارف کا تازہ شمارہ جنوری ۲۰۱۹ء ملا۔ خاصا وقیع شمارہ ہے۔ ڈاکٹر محمد یسین مظہر صدیقی اور ڈاکٹر مفتی محمد مشتاق تجاروی کے مقالے معارف کے معیار کی نمایندگی کرتے ہیں اور فکر و نظر و تحقیق و دریافت کے باب وا کرتے ہیں، ایک مضمون ''سہ ماہی رسالہ فکرونظر کا صحیح سنہ اشاعت'' اے ایم یو کے ایک نوجوان اسکالر جناب محمد حنیف خاں کا بھی ہے۔ طلبہ کے تحریر کردہ مقالات و مضامین پر میرا رویہ تحسین و تبریک کا رہا ہے تنقید یا اغلاط شماری کا نہیں، لیکن یہ مقالہ چونکہ معارف میں شائع ہوا ہے اور نتائج کے اعتبار سے بالکل غلط سمت کا تعین کرتا ہے اس لیے ضروری سمجھا گیا کہ بعض اغلاط کی نشاندہی کردی جائے۔

تقسیم ہند کے بعد قیاساً ۱۹۵۴ء کے آس پاس مسلم یونیورسٹی کے بعض علمی و ادبی افراد نے ایک ادارہ ''ادارۂ ادب علی گڑھ'' کے نام سے قائم کیا۔ اس کے سکریٹری ماہر لسانیات پروفیسر مسعود حسین خاں (ف ۲۰۱۰ء) تھے۔ اسی ادارے سے ''فکرونظر'' کے نام سے ایک چار ماہی رسالے کا اجرا کیا گیا۔ پہلا شمارہ ستمبر ۱۹۵۴ء کا شائع ہوا، اس پر بطور مدیر قاضی محمد عبدالغفار (ف ۱۹۵۶ء) کا نام درج تھا۔ یہ کتابی سائز 20x30/16 کے ۱۶۰ صفحات پر مشتمل تھا۔ مجلس ادارت میں بالترتیب قاضی محمد عبدالغفار، رشید احمد صدیقی، ڈاکٹر عبدالعلیم، اختر انصاری، معین احسن جذبی، اسلوب احمد انصاری، ڈاکٹر منیب الرحمٰن، خلیل الرحمٰن اعظمی اور ڈاکٹر مسعود حسین خاں کے نام تھے۔ رسالے کا ناشر (دہلی کا ایک پبلشر جو ۱۹۵۱ء سے علمی و ادبی کتابیں چھاپ رہا تھا) آزاد کتاب گھر کلاں محل دہلی تھا۔ اسعد فیصل فاروقی کی اطلاع کے بموجب ستمبر ۱۹۵۴ء کا یہ شمارہ کتب خانہ ابن سینا اکیڈمی علی گڑھ، اور خدا بخش لائبریری پٹنہ میں موجود ہے۔ (علی گڑھ کی اردو صحافت، دہلی ۲۰۰۷ء ص: ۲۴۳) بعد کے شماروں کا ابھی تک سراغ نہیں لگ سکا ہے کہ وہ شائع بھی ہوئے یا نہیں۔

ڈاکٹر یوسف حسین خاں (ف ۱۹۷۹ء، جو ڈاکٹر ذاکر حسین خاں کے بھائی تھے) کے اے ایم یو کے وائس چانسلر کرنل بشیر حسین زیدی (ف ۱۹۹۲ء) سے خوش گوار تعلقات تھے۔ انہوں نے وائس چانسلر کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ اے ایم یو کی جانب سے علمی و ادبی اور مذہبی رسالہ جاری ہونا چاہیے، موصوف نے اس تجویز کو پسند فرمایا۔ چنانچہ

ان کی منظوری کے بعد جنوری ۱۹۶۰ء میں اے ایم یو سے بیک وقت دو رسالے جاری ہوئے۔ ایک سہ ماہی فکر و نظر، جو یوسف حسین خاں کی ہی ادارت میں یونیورسٹی پریس سے چھپ کر شائع ہوا۔ دوسرا ششماہی ''مجلۂ علوم اسلامیہ'' جو پروفیسر مختار الدین احمد آرزو (ف ۲۰۱۰ء) کی ادارت میں شعبۂ اسلامیات کی جانب سے یونیورسٹی پریس سے چھپ کر شائع ہوا۔ فکر و نظر کے سرورق پر یہ عبارت درج ہوتی تھی ''مسلم یونیورسٹی کا سہ ماہی علمی و ادبی رسالہ'' دونوں رسائل آج بھی جاری ہیں۔ فکر و نظر کے دفتر میں اس کا مکمل فائل موجود ہے۔

اتفاق یہ ہے کہ قاضی عبد الغفار سے متعلق سوانحی کتب اور ''ورود مسعود'' (آپ بیتی مسعود حسین، مطبوعہ پٹنہ ۱۹۸۸ء) میں ادارۂ ادب علی گڑھ اور اس کے رسالے فکر و نظر کا ذکر نہیں، اور دونوں ہی رسائل پر رجسٹریشن نمبر کا بھی اندراج نہیں۔ دراصل مضمون نگار کو رسالے کی ہم نامی، مجلس ادارت اور اداریے میں مسلم یونیورسٹی اور اس کے اساتذہ کے نام نیز خط و کتابت کے لیے مسعود حسین خاں کا شعبۂ اردو کا پتا دیکھ کر یہ مغالطہ ہوا کہ یہ دونوں رسالے ایک ہیں۔ (اس زمانے میں مسعود حسین خاں شعبہ اردو میں لیکچرار تھے اور رسالے سے متعلق جملہ خط کتابت کے لیے ان کا پتا دیا گیا تھا) جبکہ یہ دونوں الگ الگ زمانے میں الگ الگ اداروں سے شایع ہوئے۔ راقم الحروف کی نظر میں ان کو ایک جاننا کسی بھی طور درست نہیں، اس کا یہ بھی خیال ہے کہ قاضی صاحب (وفات ۱۷ رجنوری ۱۹۵۶) کی ادارت میں اس کا صرف یہی مذکورہ ایک شمارہ شائع ہوسکا۔ اسعد فیصل فاروقی نے تدبر کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی کتاب ''علی گڑھ میں اردو صحافت'' میں دونوں رسائل زیر ادارت قاضی عبد الغفار (ص: ۲۴۲) اور زیر ادارت یوسف حسین خاں (ص: ۳۸۳) کا علاحدہ علاحدہ تذکرہ کیا ہے اور دونوں کے ٹائٹل کے عکس بھی دیے ہیں۔ یونیورسٹی سے وابستہ افراد نے اپنے طور پر ادارے بھی قائم کیے اور رسائل بھی جاری کیے اس قسم کی متعدد مثالیں ماضی قریب و بعید میں موجود ہیں، لیکن ظاہر ہے ان کو یونیورسٹی کا مجلہ نہیں کہا جا سکتا۔ یونیورسٹی کے مجلّے وہ کہلائیں گے جن کے مصارف یونیورسٹی خود برداشت کرے اور جن کی ادارت کے لیے بھی یونیورسٹی ہی نام طے کرے اور جس کی ملکیت کی دعویدار یونیورسٹی ہی ہو۔ میرا خیال ہے فکر و نظر کی ہم نامی سے مضمون نگار کو جو مغالطہ ہوا اور ان کی تحریر پڑھ کر اور جن لوگوں کو غلط فہمی پیدا ہوسکتی ہے، وہ مزید اطمینان کے لیے راقم الحروف سے رابطہ قائم کرکے دونوں رسائل کے پہلے شماروں کے عکس حاصل کر سکتے ہیں۔

نیاز مند
شمس بدایونی

دولت عثمانیہ

مہتمم تعلیمات دار العلوم
تاج المساجد، بھوپال

محترم مدیر معارف السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ڈاکٹر محمد عزیر صاحب سابق رفیق دار المصنّفین نے عثمانی خلافت پر دو جلدوں میں دولت عثمانیہ کے نام

سے کتاب لکھی ہے، عرصہ دراز قبل جب راقم نے اس کتاب کا مطالعہ کیا تھا تو شدت سے یہ احساس ہوا تھا کہ اس میں سلطان عبدالحمید دوم اور اتاترک سے متعلق درج معلومات مغربی تاریخ دانوں، مفکرین اور ترکی کے دور جدید کے جدیدیوں اور دین بیزاروں سے ماخوذ ہیں۔ سلطان عبدالحمید سے اچھا حکمراں اس دور انحطاط میں کوئی اور نہیں گذرا، انہوں نے ۳۰ سال تک خلافت کی حفاظت کی اور یوروپین طاقتوں کا مقابلہ کیا، اپنی بادشاہت کا خاتمہ گوارا کیا لیکن یہودیوں کو فلسطین میں قیام کی اجازت ہرگز نہیں دی، حجاز ریلوے مسلمانوں کے چندے سے بنائی جس کا مقصد عالم اسلام کے عام لوگوں کا اس سے تعلق جوڑنا تھا، دشمنوں اور یہودیوں نے موجودہ عربوں کے دلوں میں اس اہم کارنامے کے سلسلہ میں نفرت بھردی، بلکہ یہودی باوجود عثمانیوں، عبدالحمید اور ترکوں کی دشمنی کے اس ریلوے کا آج کل سوسالہ جشن منا رہے ہیں کہ اس زمانہ میں حیفا (جو آج اسرائیل میں ہے) کو اس ریلوے کے ذریعہ یوروپ سے جوڑ دیا گیا تھا اور پرلطف بات یہ ہے کہ بالکل حجاز ریلوے کے پلان کے مطابق اسرئیل عرب ملکوں میں ریلوے کا جال بچھانے کا منصوبہ بنا رہا ہے اور عرب ممالک اس منصوبہ سے بہت خوش ہیں اور اس کی تکمیل کے لیے بے تاب ہیں۔

دراصل یوروپ کے حکمراں عثمانی سلطنت کو ختم کرکے اس کو آپس میں تقسیم کرنا چاہتے تھے اور عبدالحمید دوم اس سلسلہ میں بڑی رکاوٹ تھے۔ ان کی معزولی کے چند سالوں بعد خلافت و ترکی دونوں تباہ و برباد ہوگئے۔ اتاترک اسلام کا اول نمبر دشمن تھا۔ وہ اسلام دشمن طاقتوں کے لیے ایسا نمونہ بنا کہ گذشتہ ایک صدی سے عالم اسلام کے قریب تمام حکمراں مسلم ہوتے ہوئے غیر اسلامی نظام کے نفاذ میں شامل ہوئے۔ اس کے بعد اس طرح کے خائن حکمرانوں کی ایک فہرست ہے یہ ان سب کے لیے اعلیٰ نمونہ بنا۔

ہندوستان میں ترکی کے حالات سے واقفیت کے لیے اس زمانے میں ذرائع و وسائل آج کی طرح نہ تھے لیکن جو غلطی ہوگئی اس کی اصلاح اس سب سے بڑے علمی ادارہ سے ہونا ضروری ہے۔ لیبیا کے ایک بڑے عالم اور مورخ ڈاکٹر علی محمد محمد الصلابی نے الدولۃ العثمانیہ کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی ہے، جس کی پہلی اشاعت ۲۰۱۷ء میں استنبول سے ہوئی، اس کے آخر میں ان موضوعات پر بڑے علمی انداز میں بحث کی گئی ہے۔

راقم نے اس کتاب کے صفحہ ۴۸۶ سے ۵۴۸ تک صفحات کا ترجمہ کرنے کے ساتھ ساتھ جابجا اضافے بھی کیے ہیں، کاش کوئی شخص اس پوری کتاب کا عربی سے اردو میں ترجمہ کرتا تو نفع عام ہوتا۔ امید کی جاتی ہے کہ اس اہم ترجمہ کو آپ کسی قریبی اشاعت میں شائع فرمائیں گے تاکہ عثمانی سلطنت اور اتاترک سے متعلق حقائق عام ہوسکیں۔

والسلام

(مولانا) پروفیسر محمد حسان خان

ادبیات

بیادگار معارف اعظم گڑھ یوپی ہند

۵۹ + ۲۸ + ۱۲۰۰ + ۳۹۱ + ۲۳۸

۱۹۱۶ عیسوی

جناب زاہد جعفری

''معارف کے سو سال پورے ہونے پر دو خاص نمبر شائع کیے گئے، قارئین معارف نے ان کی پذیرائی کی، ہمارے ایک محترم قاری جناب زاہد جعفری جلال پوری نے اسی وقت یعنی دو ڈھائی سال پہلے اپنے تاثرات نثر و نظم دونوں میں پیش کیے، نثر کا مضمون بھی شاعرانہ اوصاف سے خالی نہیں، خط کے آخر میں لکھا کہ ''پڑھنے کے بعد دل و دماغ اور فکر و شعور نے وجدان کے تاروں کو ایسا چھیڑا کہ قلم سے حضرت مولانا سید سلیمان ندوی کے لیے کچھ مصرعے فارسی میں موزوں ہوگئے، اس میں مادۂ تاریخ اجرا بھی ہے''۔ افسوس کہ یہ خط غلطی سے کاغذات میں رہ گیا، اب ظاہر ہوا تو تاخیر ہی سے سہی۔ کلام شاعر، قارئین سے ہم کلام ہے''۔ (معارف)

ضمیر و مقصد و فکر و دل و جان معارف! — صریرِ خامۂ شبلیؒ! حدی خوانِ معارف!

اگر فردوس بر روئے زمین است و ہمیں است — بہ بیں اہلِ نظر! کوئے گلستانِ معارف!

تو چہ دانی؟ چناں باشد مقامِ محرمِ مئے — کہ دانائے ادب بادہ گسارانِ معارف!

قلم گوید بہ ہمراہِ ہمہ اہلِ حقائق — یکے استادِ استادِ دبستانِ معارف!

می آموزند، شمارا ایں فنِ نغمہ طرازی — بم و زیر و نوائے عندلیبانِ معارف!

کرشمہ دامنِ دل می کشد اینجا کہ زاہد! — نظر کن! جانبِ نقش و نگارانِ معارف!

صدائے مرقدِ شبلیؒ نعمانی میآید — سلیمان سخن! رندِ طریقانِ معارف!

۳۹۱ + ۳۷۰ + ۲۵۴ + ۷۱۰ + ۱۹۱

سنِ اجراء ۱۹۱۶ء

محلہ جعفری باغ، جلال پور، امبیڈکر نگر۔ (Mob: 9452652488)

خود کلامی

ڈاکٹر ابرار اعظمی

میں تیرگی کا ثمر ہوں کہ روشنی کا سفر
حباب آسا ہوں یا ہوں سراب کا پیکر

ہوں محو وہم و گماں یا یقین کا پرتو
یقین کس پہ و کیوں، یا ہے سب فریب نظر

مرا وجود ہے یا ہے یہ ایک نقش برآب
یا ریگ زار جہاں میں نقوش پا کا ہنر

کہاں سے آنا کہاں جانا کچھ تو ہو معلوم
یہ زندگی ہے کہ اک سفر مدام سفر

یوں ہی میں بھیجا گیا یا کہ کوئی مقصد ہے
وہ کیا ہے کیوں ہے بتائے کوئی تو اہل نظر

ہر ایک سوز دروں اور ہر ایک درد نہاں
چلا ہی جاتا ہے کیوں ایک ''اسم'' کو سن کر

وہ اسم اعظم واولیٰ ہو ذات یا کہ صفات
نہ ذہن میں جو سمائے مثال دوں کیوں کر

نہ دیکھا اس کو سکوں اور نہ سن ہی سکوں
مگر وجود کا احساس ہوتا ہے اکثر

سنا ہے عرش معلیٰ پہ ہے وجود اس کا
مگر مری جاں سے قریب ہے اکثر

ہو لاشعور کا یا ہو شعور کا عالم
ہو میرا ذہن رسا یا ہو میرا دیدہ تر

کبھی یہ سجدہ کناں اور کبھی وہ سجدہ کناں
مرے شعور خودی تجھ کو کیا ہوا یکسر

ترے کلام سے مجھ کو شعور ذات ہوا
ترے نبیؐ کے عمل اور سلوک خاک بسر

مرے الٰہ میرے حیؐ اور مرے قیوم
ادھر بھی ایک نظر اک نظر و ایک نظر

خالص پور، اعظم گڑھ۔

مطبوعات جدیدہ

وقائع احمدی (اول، دوم، سوم): تحقیق وتجدید مولانا سید سحبان ثاقب، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد، صفحات بالترتیب ۷۰۲، ۷۱۲، ۶۷۲، قیمت: ۳۵۰ر، دوم وسوم کی قیمتیں درج نہیں، پتہ: مکتبہ الشباب العلمیہ، ٹیگور مارگ، ندوہ روڈ لکھنؤ۔۲۔

اسلامی ہند کی تاریخ میں شجاعت، سیاست، قیادت، غیرت، حمیت، رواداری، امن، آشتی، تہذیب، تمدن، علوم، فنون لطیفہ جیسے عنوانوں کی کمی نہیں، وہیں عقائد کی اصلاح اور رسوم کی درستگی کا باب اپنی مجددانہ شان اور مجتہدانہ ومجاہدانہ عزائم واعمال کی وجہ سے اس تاریخ کو سرخرو کرتا نظر آتا ہے اور بے شبہ اس باب کی سرخی میں سب سے گرم اور تابناک لہو حضرت سید احمد شہیدؒ اور ان کے اعیان وانصار کا ہے، تحریک سید شہید کے متعلق کم نہیں لکھا گیا، اس کی کامیابی اور ناکامی بھی زیر بحث آتی رہی لیکن ایک حقیقت جس پر بالعموم اتفاق کیا گیا کہ حضرت سید شہید نے دور آخر میں عقیدہ وعمل کا وہ امتزاج پیش کیا جس کو دیکھ کر عہد صحابہؓ کی یادیں تازہ ہوگئیں، زیر نظر کتاب اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ تحریک سید شہید پر جو کچھ لکھا گیا اس کا مرجع وماخذ یہی کتاب ہے۔ یہ اب تک قلمی صورت میں تھی اور خاصی ضخیم اس لیے تھی کہ مختلف اوقات میں تحریک سے وابستہ سید شہید کے خدام ومتوسلین نے اپنے اپنے طور پر داستانیں قلم بند کیں اور جیسا کہ کتاب کے سرورق پر بتادیا گیا کہ داستانیں، ٹونک کے نواب وزیر الدولہ بہادر کی ایماء پر بیان کی گئیں، اب ان کو بڑے سلیقہ اور اس سے زیادہ نہایت دیدہ ریزی سے تین جلدوں میں ابواب کے تحت یکجا کردیا گیا۔ پہلی جلد میں سترہ ابواب ہیں، پہلا باب حضرت شاہ علم اللہ کے حالات میں ہے، اس کو لکھنے والے سید حیدر علی ہیں جو پہلے تو حضرت سید شہید کے مرید ہوئے اور بعد میں ریاست ٹونک کے مدار المہام ہوئے، اندازہ ہوتا ہے کہ جلد اول کے آخری باب 'جہازوں کے تعین' میں ان ہی حیدر علی کی داستان سرائی ہے، کہیں یہ بھی اعتراف ہے کہ واقعہ میں وہ شامل نہیں تھے مگر معتبر لوگوں کی زبانی اور بعض حالات خود حضرت شہید کی زبان فیض ترجمان سے معلوم ہوئے، دوسری جلد میں سفر حجاز اور واپسی میں پنجاب وسرحد اور وہاں جہاد کی ابتدا اور جنگوں، جھڑپوں، شہادتوں، سازشوں اور قربانیوں کا ذکر ہے، پہلے باب سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ حالات، حضرت شہید کے بھانجے سید عبدالرحمٰن نے بیان کیے، تیسری جلد میں فتوحات، نظام عشر، سرگزشت مجاہدین، غدر ونفاق، مجاہدین کے مشاغل، معرکہ بالاکوٹ، رزم گاہ شہادت وغیرہ واقعات کا بیان ہے۔ ان تین جلدوں میں گویا جہاد ومجاہدہ کا عطر وخلاصہ سمٹ آیا ہے، انیسویں صدی کے اوائل کا زمانہ، اپنے واقعات کے لحاظ سے کسی اور ہی دور میں پہنچادیتا ہے۔ لائق مرتب نے صحیح کہا کہ موجودہ حالات کا تقاضا ہے کہ ایمان ویقین کو مضبوط ومستحکم کرنے کے لیے ان حالات کو پھر سے پڑھا جائے۔ اس حسن بیان کے ساتھ مرتب کا حسن سلیقہ ان کے مفید اور ضروری حواشی سے بھی ظاہر ہے۔

ع۔ص

رسید کتب موصولہ

اردو شاعری کے معتبر چہرے: اسامہ ارشاد معروفی قاسمی، نعیم بک سیلر صدر چوک مئو ناتھ بھنجن یوپی۔
قیمت: ۲۵۰/روپے

الدعوۃ الاسلامیہ فی الہند: ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری، ترتیب: فرحان انصاری، مکتبۃ الفہیم مئو ناتھ بھنجن یوپی۔
قیمت: ۵۰۰/روپے

امت کی مائیں: ڈاکٹر محمد طاہر، شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ۔
قیمت: ۲۰۰/روپے

پروفیسر لطف الرحمٰن فن اور شخصیت: ترتیب: ظفر عبدالرؤف رحمانی، رحمانی فاؤنڈیشن بیلن بازار مونگیر، بہار۔
قیمت: ۳۵۰/روپے

تمہید تمنا: عمران ساغر، بزم شعر و ادب، مئو۔
قیمت: ۲۰۰/روپے

خطوط مشاہیر بنام حضرت مولانا محمد عمران خاں صاحب ندوی: پروفیسر مسعود الرحمٰن خاں ندوی، مولانا محمد عمران خاں ایجوکیشنل اینڈ سوشل ویلفیر سوسائٹی، بھوپال۔
قیمت: ۵۰۰/روپے

خواتین کی ملازمت اسلامی اصول کی روشنی میں: ڈاکٹر عدنان حسن، ترجمہ از ہر رشید الاعظمی، دار الثقافۃ الاسلامیہ، مئو۔
قیمت: ۱۵۰/روپے

درو دیوار سے آگے: مظفر ابدالی، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ۔
قیمت: ۲۵۰/روپے

سفر نامۂ ترکی: ڈاکٹر محمد نصیر الدین منشاوی، شرفیہ قرأت اکیڈمی اینڈ ایجوکیشنل انسٹی ٹیوٹ، حیدر آباد۔
قیمت: ۲۵۰/روپے

صلوات اللہ الجلیل علیٰ نبیّہ الحبیب الجمیل: مولانا سید محمد بدر الدین قادری، ترتیب و ترجمہ: محمد آیت اللہ قادری، دار الاشاعت خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف پٹنہ، بہار۔
قیمت: ۵۰۰/روپے

صور من نشاط المدارس الاسلامیہ فی الہند: ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری، ترتیب فرحان انصاری، مکتبۃ الفہیم مئو ناتھ بھنجن۔
قیمت: ۵۰۰/روپے

طلاق حکمت اور آداب، پریشانیاں اور حل: ڈاکٹر محمد طاہر، شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ۔
قیمت: ۲۰۰/روپے

ملبیری کے آس پاس: عطاء الرحمٰن طارق، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ پرنس بلڈنگ جے جے روڈ، ممبئی۔
قیمت: ۱۵۰/روپے

تصانیف علامہ شبلی نعمانیؒ

سیرۃ النبیؐ جلد اول ودوم (یادگار ایڈیشن) 2000/-	موازنہ انیس ودبیر 250/-
سیرۃ النبیؐ	اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر 100/-
(خاص ایڈیشن مکمل سیٹ ۷ جلدیں) 2200/-	سفرنامہ روم ومصر وشام 200/-
علامہ شبلی وسید سلیمان ندوی	کلیات شبلی (اردو) 220/-
مقدمہ سیرۃ النبیؐ 30/-	کلیات شبلی (فارسی) 45/-
الفاروق 300/-	مقالات شبلی اول (مذہبی) 170/-
الغزالی 200/-	مرتبہ: سید سلیمان ندوی
المامون 175/-	مقالات شبلی دوم (ادبی) // 70/-
سیرۃ النعمان 300/-	مقالات شبلی سوم (تعلیمی) // 80/-
سوانح مولانا روم 220/-	مقالات شبلی چہارم (تنقیدی) // 200/-
شعر العجم اول 300/-	مقالات شبلی پنجم (سوانحی) // 150/-
شعر العجم دوم 150/-	مقالات شبلی ششم (تاریخی) // 90/-
شعر العجم سوم 125/-	مقالات شبلی ہفتم (فلسفیانہ) // 100/-
شعر العجم چہارم 200/-	مقالات شبلی ہشتم (قومی واخباری) // 110/-
شعر العجم پنجم 150/-	خطبات شبلی مرتبہ: عبدالسلام ندوی 80/-
الانتقاد علی تاریخ التمدن الاسلامی 350/-	انتخابات شبلی مرتبہ: سید سلیمان ندوی 45/-
(محقق ایڈیشن) تحقیق: ڈاکٹر محمد اجمل ایوب اصلاحی	مکاتیب شبلی اول // 150/-
الکلام 250/-	مکاتیب شبلی دوم // 190/-
علم الکلام 200/-	اسلام اور مستشرقین چہارم (علامہ شبلی کے مقالات) 250/-

ISSN 0974 - 7346 Ma'arif (Urdu) -Print
March 2019 Vol - 203 (3)
RNI. 13667/57 MA'ARIF AZM/NP-43/019
Monthly Journal of
Darul Musannefin Shibli Academy
P.O.Box No: 19, Shibli Road, Azamgarh, 276001 U.P. (India)

مطبوعات شبلی صدی

۱۔	سیرۃ النبیؐ جلد اول و دوم (یادگار ایڈیشن)	علامہ شبلی نعمانی	2000/-
۲۔	شبلی کی آپ بیتی	ڈاکٹر خالد ندیم	325/-
۳۔	دار المصنّفین کے سو سال	کلیم صفات اصلاحی	350/-
۴۔	شذرات شبلی (الندوہ کے شذرات)	مرتبہ: ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی	220/-
۵۔	محمد شبلی لائف اینڈ کنٹری بیوشنس	ڈاکٹر جاوید علی خاں	230/-
۶۔	حیات شبلی	علامہ سید سلیمان ندوی	650/-
۷۔	مولانا الطاف حسین حالی کی یاد میں	اشتیاق احمد ظلی	250/-
۸۔	حیات سعدی	تصنیف: خواجہ الطاف حسین حالی	400/-
۹۔	شبلی شناسی کے اولین نقوش	مرتبہ: ظفر احمد صدیقی	600/-
۱۰۔	شبلی ایک دبستان	آفتاب احمد صدیقی	250/-
۱۱۔	متاع رفتگاں	شاہ معین الدین احمد ندوی	200/-
۱۲۔	یہود اور قرآن مجید	مولانا ضیاء الدین اصلاحی	150/-
۱۳۔	رسائل شبلی	علامہ شبلی نعمانی	300/-
۱۴۔	اردو ترجمہ مکاتیب شبلی	ڈاکٹر خالد ندیم	110/-
۱۵۔	تاریخ بدء الاسلام (علامہ شبلی نعمانی)	مرتبہ: ڈاکٹر محمد اجمل ایوب اصلاحی	300/-
۱۶۔	مراسلات شبلی	ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی	150/-
۱۷۔	مطالعات شبلی	مرتبہ: اشتیاق احمد ظلی	550/-
۱۸۔	الفاروق (ہندی)	علامہ شبلی نعمانی	450/-
۱۹۔	الندوہ (جلد ۱۔۹)		4735/-